وفاق المدارس العربیہ پاکستان کا ترجمان

ماہنامہ وفاق المدارس ملتان

جلد نمبر: ۲۳ شمارہ نمبر ۱ محرم الحرام ۱۴۴۷ھ جولائی ۲۰۲۵ء

سرپرست

شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

شیخ الحدیث حضرت مولانا انوار الحق حقانی مدظلہم
سینئر نائب صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر اعلیٰ

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری مدظلہم
ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان

مدیر

مولانا محمد احمد حافظ

بیاد

شمس العلماء
حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ

استاذ العلماء
حضرت مولانا خیر محمد جالندھری رحمۃ اللہ علیہ

محدث العصر
حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

مفکر اسلام
حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہ

جامع المعقول والمنقول
حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ

رئیس المحدثین
حضرت مولانا سلیم اللہ خان رحمۃ اللہ علیہ

استاذ المحدثین
حضرت مولانا عبدالرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ

وفاق المدارس العربیہ پاکستان گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

فون نمبر 061-6514525-6514526-27 فیکس نمبر 061-6539485

Email:wifaqulmadaris@gmial.com web:www.wifaqulmadaris.org

ناشر: حضرت مولانا محمد حنیف جالندھری ◉ مطبع: اقرا اختر پرنٹنگ پریس پرانی غلہ منڈی بوہڑ گیٹ ملتان

شائع کردہ مرکزی دفتر وفاق المدارس العربیہ گارڈن ٹاؤن شیر شاہ روڈ ملتان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

ایران اسرائیل جنگ کا سبق	کلمۃ المدیر	۳
محرم الحرام اور یوم عاشوراء	مولانا عبدالقوی ذکی حسامی	۶
امیر المؤمنین خلیفہ ثانی سیدنا حضرت عمر فاروقؓ	مولانا محمد جہان یعقوب	۱۲
اہلِ بیتِ اطہار رضی اللہ عنہم، تذکرہ ومختصر تعارف	مولانا مفتی عبدالصمد ساجد	۲۰
وضعِ حدیث کی ابتداء اور دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم	مولوی محمد ارشاد بن قیمت بہادر	۳۴
شنقیطی محاظر اور برصغیر کے دینی مدارس	ڈاکٹر عامر بہجت حفظہ اللہ	۴۲
کم عمری کی شادی کے خلاف قانون کا ایک جائزہ	محمد احمد حافظ	۴۸
مدرسین حضرات کیلئے دس نصیحتیں	مولانا قاری امیر حسن	۵۶
مطالعے کی میز پر	محمد احمد حافظ	۶۰

سالانہ بدل اشتراک

بیرون ملک امریکہ، آسٹریلیا، جنوبی افریقہ اور یورپی ممالک ۳۰ ڈالر-سعودی عرب، انڈیا اور متحدہ امارات وغیرہ ۲۳ ڈالر-ایران، بنگلہ دیش ۲۰ ڈالر-

اندرون ملک قیمت: فی شمارہ: 40 روپے، زرسالانہ مع ڈاک خرچ: 540 روپے

كلمة المدير

ایران اسرائیل جنگ کا سبق

ہے جرمِ ضعیفی مرگ مفاجات !

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم!

زمانہ تیزی سے کروٹیں بدل رہا ہے، آئے روز نت نئے حوادث پیش آرہے ہیں، عجیب وغریب واقعات جنم لے رہے ہیں، انسان ابھی ایک حادثے کے اثرات سے نکل نہیں پاتا کہ ایک اور عالمگیر حادثہ وقوع پذیر ہو چکا ہوتا ہے۔ یہ حوادث، یہ واقعات محض انسانی فکر وخیال اور عقائد ونظریات کو متاثر نہیں کرتے بلکہ جغرافیائی سرحدوں کو بھی پامال کرتے ہیں۔

گزشتہ ماہ ایران اسرائیل جنگ شروع ہوکر ختم بھی ہوگئی، جس ڈرامائی انداز میں اس جنگ کا خاتمہ ہوا؛ اس نے اپنے پیچھے بہت سی کہانیاں چھوڑی ہیں، کچھ سوالیہ نشانات ہیں جو شاید ایک مدت بعد ہی حل ہوسکیں۔ صدر امریکا نے اس مختصر جنگ کے دوران جو گوہر افشانیاں کیں اس نے بھی ایک لحاظ سے صورت حال کو مضحکہ خیز بنائے رکھا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ اسرائیل کا ایران پر حملہ ایک سوچی سمجھی سازشی اسکیم کا حصہ تھا۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ اسرائیل غزہ کو ملیامیٹ کر چکا ہے، حماس کی مزاحمت اس کے نزدیک اب چند دنوں کی بات ہے۔ اس نے اپنے تئیں عراق، شام، لبنان اور مصر کو پہلے سے زیر کر رکھا ہے، اردن کی بھی یہی کیفیت ہے، جزیرۃ العرب کے بعض ممالک اسرائیل کے ساتھ سفارتی روابط رکھتے ہیں۔

اسرائیل کے مقاصد ڈھکے چھپے نہیں ہیں، وہ ''گریٹر اسرائیل'' کے قیام کے لیے محوِ سفر ہے۔ اس کے نزدیک بہت سا کام ہو چکا ہے۔ وہ کھلے بندوں اعلان کر رہا تھا کہ اس نے موجودہ ایرانی قیادت کو تبدیل کرنا ہے۔ اس نے ایران کے قلب میں بیٹھ کر اپنے کارندوں کے ذریعے جس طرح حملے کیے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت پہلے سے ان حملوں کی تیاری کر رہا تھا۔ اسرائیلی طیارے ایران کی فضاؤں میں موت کا پیغام لے کر گئے اور اپنی جارحیت کے ذریعے دنیا کو یہ باور کروادیا کہ وہ کسی بین الاقوامی قانون یا اقوام متحدہ کے چارٹر کو خاطر میں نہیں لاتا۔ یہ حملے محض اسرائیل کی جانب سے اپنی طاقت کا اظہار نہیں تھے، بلکہ امریکہ اور مغربی سامراج کی اُس سازش کا حصہ تھے جو مشرق وسطیٰ کو کمزور در کمزور کرنے کے درپے ہے۔ اسرائیلی حملے کا جواز ہمیشہ ''دفاع'' کے نام پر دیا جاتا ہے، مگر حقیقت میں یہ حملے خطے میں طاقت کے توازن کو بگاڑنے کی ایک منظم کوشش تھے۔

بعض دانشور اور تجزیہ کار کبھی جلی اور کبھی خفی انداز میں اس بات کا اظہار بھی کرتے رہے کہ ایران کے بعد پاکستان اور ترکی کی باری ہے۔ یقیناً دونوں ممالک کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہے، اور وہ حالات پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ پاکستان الحمدللہ اعلانیہ ایٹمی طاقت ہے، اور یہ طاقت اسرائیل سمیت بہت سے اسلام دشمنوں کو کھٹکتی ہے۔ اسرائیل پاکستان کی ایٹمی طاقت کو سبوتاژ کرنے کے لیے کئی مرتبہ بروئے کار آچکا ہے۔ اس لیے پاکستان اور ترکی کبھی نہیں چاہیں گے کہ ان کی سرحدوں پر اسرائیل نواز حکومت آ کر بیٹھ جائے۔ اگر خدانخواستہ عالم اسلام کے دو ممتاز ملک پاکستان اور ترکی کو کمزور کر دیا گیا تو پھر پورے عالم اسلام میں طاقت کا توازن بگڑ کر رہ جائے گا۔

اس جنگ سے مسلم ممالک کی عسکری اہلیت، مہارت اور بالادستی کی ضرورت کھل کر سامنے آتی ہے۔ ایران اس لیے اسرائیل کا مقابلہ کر پایا کہ اس نے اپنے وسائل میں رہتے ہوئے عسکری تیاریاں جاری رکھیں اور اسرائیل کو مناسب جواب دیا۔ یہ حقیقت کھل کر دنیا کے سامنے آ گئی کہ اسرائیل ناقابل تسخیر ریاست نہیں ہے۔

اس سے قبل پاک انڈیا جھڑپوں میں تو اور بھی یہ حقیقت کھل کر سامنے آ چکی ہے کہ آپ اسی وقت محفوظ و مامون ہیں جب آپ کا دفاع مضبوط ہو۔ پاکستان کے آپریشن بنیان مرصوص نے دور جدید کی عسکری تاریخ میں ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ پاکستان اپنے سے بیس گنا بڑی طاقت کو اسی شکست دے سکا کہ اس نے کبھی اپنے دفاع پر نہ کمپرومائز کیا اور نہ ہی اس میں سستی برتی۔

افسوس ناک امر یہ ہے کہ عالم اسلام کے دو چار ممالک کو چھوڑ کر باقی تمام ممالک عسکری میدان میں صفر اہلیت رکھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اپنی سلامتی کے لیے غیروں کے محتاج ہیں۔ دشمن جب چاہتا ہے کسی نہ کسی مسلم ملک پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ افغانستان، عراق، شام، سوڈان وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں، جہاں برسوں خون کی ندیاں بہائی گئیں، یہاں تک کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے بعض مسلم ملکوں کے جغرافیے تک تبدیل کر دیے گئے۔

ہم وہ امت ہیں جسے تعلیم دی گئی ہے کہ:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (الانفال:60)

''جہاں تک ہو سکے طاقت سے اور گھوڑوں کے تیار رکھنے سے ان کے مقابلہ کے لئے مستعد رہو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں پر ہیبت بیٹھی رہے گی۔''

زمانے کے لحاظ سے فنون حرب وضرب میں تبدیلی آتی رہتی ہے۔ عسکری علوم وفنون کی تعلیم وتربیت اور جدید اسلحہ کے استعمال کرنے کی مہارت، شجاعت و بہادری کی مشق اور جنگی امور و معاملات میں حذاقت و دانشمندی کے بغیر دفاع وطن کا فریضہ کما حقہ انجام نہیں دیا جا سکتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا آیت: وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ. من قوة کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

أَلا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّمي، أَلا إِنَّ الْقُوَّةَ الرَّميُ، أَلا إِنَّ الْقُوَّةَ الرمي (صحیح مسلم)

''سن لو! بیشک قوت تیراندازی ہے۔ بیشک قوت تیراندازی ہے۔ بیشک قوت تیراندازی ہے۔''

آپ کی بیان فرمائی ہوئی یہ تفسیر ہر زمانہ کو عام اور ہر طرح کے جدید اسلحے مثلاً: بم، گولے، راکٹس اور میزائلز وغیرہ کو شامل ہے۔ اس لیے مسلم ممالک کو بالعموم اور وہ ریاستیں جنہیں معاشی استحکام حاصل ہے انہیں بالخصوص اس جانب پیش رفت کرنی چاہیے۔ ورنہ یاد رکھنا چاہیے کہ ''ہے جرم ضعیفی مرگ مفاجات''!۔

یہاں اس موقع پر ہم کچھ باتیں ایرانی قیادت سے بھی کہنا چاہتے ہیں۔ ایرانی قیادت کو چاہیے کہ وہ اپنی سابقہ پالیسیوں، اور سفارتی رویوں پر غور کرے۔ سن دو ہزار تین سے دو ہزار چوبیس تک پڑوسی سنی ممالک پر جو قیامتیں گزریں؛ ان میں بہت کچھ حصہ ایران کا بھی تھا۔ عراق اور شام میں ایران کی مدد سے اہلسنت کے خون کی جو ندیاں بہائی گئیں وہ تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔ زینبیون، فاطمیون اور الحشد الشعبی جیسے پچاس کے قریب ایرانی پراکسی گروپ بشار الاسد کی حمایت میں مصروف رہے، لاکھوں عراقی اور شامی عوام تہ تیغ ہوئے یا اپنے شہروں اور بستیوں سے ہجرت پر مجبور ہوئے۔ ایران کا چاہ بہار پاکستان کے خلاف راسرگرمیوں کا مرکز رہا۔ حالیہ ایران اسرائیل جنگ میں تو یہ بات بھی سامنے آئی کہ چاہ بہار صرف پاکستان مخالف سرگرمیوں کا مرکز نہیں تھا بلکہ ایران کے خلاف انڈیا کی مدد سے اسرائیلی ایجنٹ بھی سرگرم تھے۔

اس کے باوجود مشکل وقت میں اگر کسی نے ہمدردی کا اظہار کیا، یا دَست تعاون بڑھایا تو وہ تمام سنی ممالک تھے، پاکستان نے کھل کر ایران کی حمایت کی، سعودیہ نے نہ صرف ایران سے اظہار ہمدردی کیا بلکہ تعاون کی یقین دہانی بھی کروائی، اس نے ایرانی حجاج کے ساتھ حسنِ سلوک کی روایت بھی قائم رکھی ہے۔ بہت سے ایرانی حجاج امارت اسلامی افغانستان کے راستے سے اپنے ملک ایران گئے ہیں۔

ایران کو یہ بھی سوچنا ہے کہ کون سے پڑوسی ملک کے ساتھ اس کے مثالی سفارتی تعلقات رہے؟، اگر ایران پڑوسی ممالک میں اپنا مخصوص مذہبی انقلاب برآمد کرنے کی بجائے اپنے داخلی استحکام پر توجہ دیتا تو شاید آج وہاں سے نہ یہودی جاسوسوں کی فوج ظفر موج درآمد ہوتی نہ اتنی تباہی پھیلتی۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہولناک جنگوں سے ہمارے مسلم خطوں کی حفاظت فرمائے، اور اسلام دشمن قوتوں کے عزائم کو خاک میں ملائے۔ آمین ثم آمین!۔

مقالات ومضامین

محرم الحرام اور یوم عاشوراء

فضائل اور تاریخ

مولانا عبدالقوی ذکی حسامی

تاریخی نظام اور اس کی ضرورت:

سکینڈ سے گھنٹہ، گھنٹہ سے دن، مہینہ اور سال تک کے معمولات کو صحیح انداز اور مناسب تقسیم کرنے کو بزبانِ عربی تقویم، اردو میں نظام الاوقات، ہندی میں جنتری اور انگریزی میں کیلنڈر کہتے ہیں۔ اور وقت وہ شئے ہے جو اپنے محور میں گھومتا رہتا ہے۔ اسی وقت سے فرد سے قوم تک کے حالات وواقعات درج ہوکر ماضی کے حوالہ ہوجاتے ہیں، جس سے عبرت ونصیحت لے کر انسان اپنے مستقبل کے معاملات طے کرتا ہے۔ علاوہ ازیں انسان کے لیے سیاسی، سماجی اُمور، معاشرتی تقریبات اور مذہبی فرائض کی انجام دہی کے لیے ایک مرتب نظام کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے بغیر انسان کا مفوضہ ذمہ داری کو نبھانا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔

تاریخی نظام کی اقسام:

اسی مقصد کے تحت دنیا میں مختلف نظام الاوقات رائج ہیں، عمومی طور پر دو نظام معروف ہیں:

1-شمسی: جنوری سے دسمبر تک　　　2-قمری: محرم الحرام سے ذوالحجہ تک۔

شمسی تاریخ کو عیسوی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے) نسبت حاصل ہے۔ اور نظامِ قمری ہجرتِ نبوی کی طرف منسوب ہے۔ موجودہ دور میں عموماً سرکاری وغیرسرکاری، نجی وملکی تمام تر معاملات شمسی تواریخ کے لحاظ سے انجام پاتے ہیں، البتہ اسلامی احکام وفرائض قمری نظام سے مربوط ہیں، جیسے: روزہ، زکوٰۃ، حج، عیدین، وغیرہ۔

قمری سن کی اہمیت:

قمر لغتِ عربی میں چاند کو کہتے ہیں، اسی کی طرف نسبت کرتے ہوئے قمری کہتے ہیں، کیونکہ اس نظام کا سارا دارومدار چاند کے گھٹنے اور بڑھنے پر ہے۔ اور یہ قمری تاریخی کیلنڈر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس عمل ہجرت سے وابستہ ہے۔ (ماہِ محرم الحرام کے فضائل واحکام)

حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ ''إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ'' کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

’’قمری مہینوں کی جو ترتیب اسلام میں معروف ہے، وہ رب العالمین کے ترتیب کردہ ہیں، جس میں خاص مہینوں کے مخصوص احکام نازل فرمائے ہیں، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کے یہاں احکامِ شرعیہ میں قمری سن معتبر ہے، اور یہ اللہ کو پسند ہیں، اسی لیے قمری حساب کا محفوظ رکھنا فرضِ کفایہ ہے، اگر ساری اُمت قمری حساب کو ترک کردے تو گنہگار ہوگی۔قمری حساب محفوظ رہے تو شمسی تواریخ کا استعمال بھی جائز ہے۔‘‘
(معارف القرآن، ج:۴،ص:۳۷۳)

قمری سال کا پہلا مہینہ (محرم الحرام):

محرم کے معنی: معظم، محترم اور معزز ہیں، اس ماہ کا شمار اشہرِ حرم میں سے ہے، جن کی عظمت وفضیلت کتاب وسنت میں آئی ہے، جن میں اعمالِ صالحہ کا اجر وثواب دوگنا کر کے دیا جاتا ہے۔ یہ مہینہ ایسی بزرگی والا ہے جس کا ادب واحترام نزولِ کتاب کے زمانہ میں اہلِ کتاب اور کفارِ مکہ بھی کیا کرتے تھے۔بعض علمائے سلف نے اشہرِ حرم میں بھی محرم الحرام کو افضل لکھا ہے، چنانچہ حافظ ابن رجب حنبلیؒ فرماتے ہیں:

’’وقد اختلف العلماء في أي الأشهر الحرم أفضل؟ فقال الحسن البصري رحمه الله: أفضلها شهر الله المحرم، ورجَحهٗ طائفة من المتاخرين۔‘‘

’’علماء کرام نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے کہ اشہرِ حرم میں کونسا مہینہ افضل ہے؟ حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا: ان میں افضل مہینہ اللہ کا مہینہ محرم ہے، اور متاخرین میں سے ایک جماعت نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔‘‘
(خصوصیاتِ ماہِ محرم الحرام ویومِ عاشوراء)

محرم الحرام کے فضائل:

ماہِ محرم الحرام ان چار مہینوں میں سے ایک ہے، جن کی حرمت وعظمت کو اللہ تعالیٰ نے کائنات بناتے وقت ہی لکھ دیا، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

’’اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ‘‘ (سورۃ التوبہ:۳۶)

’’یقیناً شمار مہینوں کا (جو کہ) کتابِ الٰہی میں اللہ کے نزدیک (معتبر ہیں) بارہ مہینے (قمری) ہیں جس روز اللہ تعالیٰ نے آسمان اور زمین پیدا کیے تھے (اسی روز سے اور) ان میں چار خاص مہینے ادب کے ہیں۔‘‘ (حضرت تھانویؒ)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''حرمت کے مہینوں میں نیک کام کرنے کا ثواب بہت بڑا ہے، لہٰذا ان میں گناہ کرنے کا عذاب بھی بہت بڑا ہے، اگرچہ گناہ ہر زمانہ میں (برائی کے لحاظ سے) بڑا ہوتا ہے۔'' (مظہری)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں کہ: ''تمام انبیاء کی شریعتیں اس پر متفق ہیں کہ ان چار مہینوں میں عبادت کا ثواب زیادہ ہوتا ہے اور ان میں کوئی گناہ کرے تو اس کا وبال وعذاب بھی زیادہ ہوتا ہے۔'' (معارف القرآن)

علامہ ابن رجبؒ فرماتے ہیں کہ: اسلاف تین عشروں کی بہت عظمت ولحاظ کرتے تھے: 1- رمضان المبارک کا آخری عشرہ، 2- ذی الحجہ کا پہلا عشرہ، 3- محرم الحرام کا پہلا عشرہ۔ (محرم الحرام کا مہینہ)

امام نسائیؒ نے اس ماہِ مبارک کی فضیلت پر یہ روایت نقل فرمائی ہے:

''**عن أبي ذر رضی اللہ عنہ قال: سألتُ النبي صلی اللہ علیہ وسلم أيُ الليل خير؟ و أي الأشهر أفضل؟ فقال: خير الليل جوفه، و أفضل الأشهر شهر الله الذي تدعونه المحرم۔**''

''حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، انہوں نے کہا: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: رات کا کونسا حصہ بہتر ہے؟ اور کونسا مہینہ افضل ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رات کا درمیانی حصہ بہتر ہے، اور مہینوں میں افضل مہینہ اللہ کا مہینہ ہے، جس کو تم محرم کہتے ہو، لیکن ماہِ رمضان اس سے مستثنیٰ ہے۔'' (خصوصیاتِ ماہِ محرم الحرام)

محرم الحرام میں روزوں کی فضیلت:

ماہِ محرم الحرام میں نفلی روزوں کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اس مہینہ کو اللہ سے نسبت حاصل ہے اور یہ نسبت ماہِ محرم کی فضیلت کو بتلاتی ہے، حدیث پاک میں ارشاد ہے:

''**أفضل الصيام بعد رمضان شهر الله المحرم۔**'' (رواہ مسلم، بحوالہ مشکاۃ، رقم: ۲۰۴۸)

''رمضان کے روزے کے بعد بہترین روزے اللہ کا مہینہ محرم ہے۔''

اس حدیث میں محرم کے عام نفلی روزے مراد ہیں اور یہی راجح قول ہے۔ (ماہِ محرم الحرام کے فضائل واحکام)

نیز فقہاء کرام اشہرِ حرم میں بطور خاص محرم کے مہینہ میں نفلی روزوں کے حسبِ حیثیت اور وسعت مستحب ہونے کے قائل ہیں۔ (حوالہ سابق)

ماہِ محرم کے چند اہم تاریخی واقعات:

ماہِ محرم ۷ھ میں غزوۂ خیبر ہوا۔ ماہِ محرم ۱۴ھ میں جنگ قادسیہ ہوئی، اس جنگ میں مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت

سعد بن ابی وقاصؓ تھے اور کفار کا سردار مشہور زمانہ رستم تھا، تین دن کے سخت مقابلہ کے بعد چوتھے روز مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی۔ ماہِ محرم ۱۸ھ شام اور عراق میں طاعونِ عمواس کی سخت جان لیوا وبا پھیلی تھی، اور حضرت ابوعبیدہ ابن الجراح رضی اللہ عنہ کا انتقال بھی اسی بیماری سے ہوا جو اس وقت مسلمانوں کے لشکر کے ساتھ اس علاقہ میں مصروفِ جنگ تھے۔ اور اسی سن میں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اپنے بھائی یزید بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے دمشق کے گورنر مقرر ہوئے۔ ماہِ محرم ۲۴ھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ مصر میں فاتحانہ داخل ہوئے، اور یہی وہ سن ہے جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تختِ خلافت پر متمکن ہوئے۔ ماہِ محرم ۶۱ھ میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے مع رفقاء جامِ شہادت نوش کیا۔ ماہِ محرم ۶۷ھ میں کوفہ کا گورنر عبیداللہ بن زیاد قتل ہوا۔ ماہِ محرم ۷۴ھ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی وفات ہوئی۔ (ملخص از ماہِ محرم الحرام کے فضائل اور احکام)

یہ وہ چند تاریخی اشارے ہیں جو محرم الحرام میں واقع ہوئے ہیں، اس کے علاوہ بے شمار اور تاریخی حقائق کتبِ سیر میں مذکور ہیں۔

صومِ عاشوراء کے فضائل:

صوم عاشوراء کی فضیلت محرم الحرام کے دیگر ایام سے بڑھی ہوئی ہے، اور احادیث میں اس کے فضائل وارد ہوئے ہیں، جمہور صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدین کی رائے یہی ہے کہ عاشوراء سے دس محرم کا روزہ مراد ہے، اور لُغت کی رُو سے بھی عاشورہ کا لفظ دس محرم پر صادق آتا ہے:

''عن عائشة رضی اللہ عنها قالت: كان رسول اللہ صلى اللہ عليه وسلم أمر بصيام يوم عاشوراء، فلما فُرض رمضان كان من شاء صام ومن شاء أفطر۔'' (بخاری:۲۰۰۱)

''حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کا روزہ رکھنے کا حکم دیا تھا۔ جب رمضان کے روزے فرض کر دیے گئے (اختیار دیا گیا) جو چاہے روزہ رکھے اور جو چاہے نہ رکھے۔''

ایک حدیث میں اس دن کو اللہ رب العزت کا دن قرار دیا گیا، چنانچہ ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے یہ روایت منقول ہے کہ:

''قال رسول اللہ صلى اللہ عليه وسلم: هذا يوم من أيام اللہ، فمن شاء صامه ومن شاء تركه۔'' (ابوداؤد: ۲۴۴۳)

اوراس دن روزہ رکھنے کا ثواب یہ ہے کہ سال گزشتہ کے گناہ معاف کردئے جاتے ہیں۔حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں ارشادِنبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے:

''وسئل عن صوم یوم عاشوراء، فقال یکفر السنة الماضیة۔''(مسلم:۱۱۲۶)

اس حدیث کے ضمن میں یہ بات ملحوظ رہے کہ گناہوں سے صرف صغائر معاف ہوں گے، البتہ کبائر کے لیےتوبہ شرط ہے۔

تنہا صوم عاشوراء اورمخالفتِ یہود:

یہود اسلام کے ازلی دشمن ہیں، ان کی مخالفت سنتِ نبوی ہے، اسی وجہ سے اسلام کے بیشتر احکامات میں ان کی مخالفت قولاًوعملاً کی گئی، ابتدا میں صرف ایک روزہ رکھا جاتا تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ یہود بھی روزہ رکھا کرتے ہیں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی مخالفت میں مزید ایک روزہ اضافہ کرنے کا حکم دیا، اس کی تائید ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک روایت سے ہوتی ہے:

''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: صوموا التاسع والعاشر وخالفوا الیہود۔''(ترمذی:۷۵۵)

یا نو تاریخ کے بجائے گیارہ تاریخ کو روزہ رکھ لیا جائے، اس کا ثبوت حضرت عباس رضی اللہ عنہما کی ایک دوسری روایت میں ہے:

''قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: صوموا یوم عاشوراء وخالفوا الیہود، صوموا قبله یوماً أو بعدهٗ یوماً۔'' (مسند احمد)

فقہائے کرام نے ان ارشادات کی روشنی میں تنہا دس محرم کا روزہ رکھنا مکروہِ تنزیہی یعنی خلافِ اولیٰ لکھا ہے، اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف عاشوراء کا روزہ رکھنا گناہ ہے، یہ بے اصل بات ہے۔(ماہ محرم کے فضائل اور احکام)

بعض اہلِ علم کی رائے ہے کہ فی زمانہ اہلِ یہود کے روزہ نہ رکھنے کی وجہ سے تشبہ نہیں پایا جاتا ہے، اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اول اس کا قطعی علم نہیں کہ وہ روزہ رکھتے ہیں یا نہیں۔(کذا فی فتاویٰ رحیمیہ، ج:۵،ص:۱۹۷) دوسرا یہ کہ نو اور گیارہ کا روزہ رکھنا منصوص ہے اور چودہ سو سال سے تعاملِ ناس ہے۔(المغنی لابن قدامہ، بحوالہ حاشیہ ماہِ محرم کے فضائل اور احکام)

یومِ عاشوراء سے وابستہ تاریخ:

حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش اس دن ہوئی، حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی جبلِ جودی پر اس دن ہی

آٹھہری، حضرت یونس علیہ السلام اسی دن مچھلی کے پیٹ سے باہر آئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ سے خلاصی ملی وہ یہی دن تھا، حضرت یعقوب علیہ السلام کی ملاقات حضرت یوسف علیہ السلام سے اسی دن ہوئی، اور حضرت یوسف علیہ السلام تختِ خلافت پر دس محرم ہی کو متمکن ہوئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی دن اپنی قوم سمیت فرعون سے نجات پائی، اور اسی دن حضرت عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے، اسی دن حضرت سلیمان علیہ السلام کو آزمائش کے بعد بادشاہت ملی، اور حضرت ایوب علیہ السلام کو بھی بعد امتحان شفا اسی روز ملی، یہی وہ دن ہے جس میں حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اُٹھالیا گیا، اور یہی وہ دن ہے جس میں جگر گوشۂ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے باطل سے ٹکرا کر جامِ شہادت گلے لگایا، اسی دن اس کائنات کی بساط لپیٹ کر قیامت برپا کردی جائے گی۔(فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، بحوالہ خصوصیات ماہ محرم الحرام و یوم عاشوراء، ومعارف القرآن[ملخصاً])

اس ماہ میں کرنے کے کام:

اس ماہ میں چند کام ہیں جن کو ہمیں انجام دینا ہے: ۱- یوم عاشوراء کا روزہ رکھنا، ۲- گھر والوں پر خرچ میں توسُّع کرنا، ۳- فرائض کا اہتمام اور نفلی عبادات بکثرت کرنا، ۴- گناہوں سے بچنے کی کوشش کرنا، ۵- اتباعِ سنت کا التزام کرنا۔

اس ماہ میں نہ کرنے کے کام:

وہ امور جن سے اس ماہ میں بچنا ہے وہ یہ ہیں: ۱- کالا لباس پہننا اور کالا جھنڈا لگانا، ۲- نحوست اور غم کا مہینہ سمجھنا، ۳- سوگ وتعزیہ اور ماتم کرنا، ۴- شربت وغیرہ کی سبیلیں لگانا، ۵- دیگر من گھڑت رسموں کو اپنانا۔

امیر المؤمنین خلیفہ ثانی سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ

سیرت، کردار، خلافت وشہادت

مولانا محمد جہان یعقوب

ولادت:

آپ کی پیدائش نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مبارکہ کے تیرہ سال بعد مکہ مکرمہ ہوئی۔

سلسلہ نسب:

آپ کا نام عمر، والد کا نام خطاب، لقب فاروق اور کنیت ابوحفص ہے۔آپ کا سلسلہ نسب یوں ہے: عمر بن خطاب بن نفیل بن عبدالعزیٰ بن رباح بن عبداللہ بن قرط بن زراع بن عدی بن کعب بن لوی بن فہر بن مالک (مستدرک حاکم) جناب عدی کے ایک بھائی کا نام مرہ تھا، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں سے ہیں، اس لحاظ سے حضرت عمر کا سلسلہ نسب آٹھویں پشت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جاملتا ہے۔

فاروق لقب کی وجہ:

آپ کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ''فاروق'' کا لقب عطا کیا گیا ہے۔وجہ اس کی یہ بنی کہ حضرت عمر نے مکہ میں اسلام قبول فرمایا اور اس کے بعد اپنے مشرک ماموں عاص بن وائل کی پناہ میں آنے سے انکار کر دیا اور مسلمانوں کے ساتھ علانیہ بیت اللہ میں نماز ادا کی۔اس کے صلے میں دربارِ نبوت سے فاروق کا لقب ملا۔جس کے معنی ہیں حق اور باطل میں فرق کرنے والا۔(تاریخ اسلام، الفاروق، خلفائے راشدین)

افضلیت بعد صدیقِ اکبرؓ:

عرب میں پڑھنے لکھنے کا رواج نہیں تھا، لیکن آپ ان 17 افراد میں شامل تھے، جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے، لہٰذا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کاتبِ وحی جیسا عظیم منصب عطا فرمایا۔حضرت عمر فاروق ابتدائی دِنوں کے کاتبینِ وحی میں سے ایک تھے اور انھوں نے ہی سیدنا ابوبکر صدیق کو باصرار کلامِ پاک کی تدوین پر آمادہ کیا تھا۔اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا شمار عشرہ مبشرہ یعنی ان صحابہ کرام میں بھی ہوتا ہے، جن کے جنتی ہونے کی ایک

ہی مجلس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی، نیز معراج کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا محل بھی دیکھا تھا۔ امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے بعد سب سے افضل حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ہیں۔

عمومی سیرت:

حضرت عمر فاروق بہترین انتظامی صلاحیتوں، اعلیٰ اوصاف، دبنگ اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ ظہورِ اسلام کے وقت، اسلام اور مسلمانوں کے سخت دشمن تھے، لیکن جب اسلام قبول کر لیا، تو پھر اپنا تن، من، دھن سب اسلام کے لیے وقف کر دیا۔ سخت مزاجی کے باوجود، عاجزی، انکساری، تواضع اور عدل، مزاج کا حصہ تھے۔ خلافت کا بوجھ کندھوں پر آیا، تو گریہ اور رِقت میں اضافہ ہو گیا۔ شب کی تنہائیوں میں رب کے حضور آنسو بہانا اور گڑگڑانا ان کا معمول تھا۔

موافقاتِ عمرؓ:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرے رب نے تین مواقع پر میری رائے سے اتفاق کیا۔

(1) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کاش ہم مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بناتے، جس کے بعد اللہ نے سورہ بقرہ میں فرما دیا اور مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنا لو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق نے ایک مرتبہ اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ کاش! اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقام ابراہیم پر نماز پڑھنے کا حکم آ جائے، حضرت عمر فاروق خود کہتے ہیں کہ جب میرا گزر مقام ابراہیم پر ہوا تو میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ کیا ہم حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے کھڑے ہونے کی جگہ کے پیچھے نماز پڑھیں؟ ابھی اس بات پر تھوڑا سا وقت بھی نہ گزرا تھا کہ یہ آیت اتری۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی اس خواہش کو پورا فرمایا: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (سورۃ البقرہ، آیت 125) ترجمہ: اور بناؤ ابراہیم (علیہ السلام) کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ۔

(2) میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ازواجِ مطہرات کو پردے کا حکم دیجیے۔ تو اللہ نے سورۂ احزاب میں فرما دیا: یایہا النبی ۔۔۔۔ غفورا رحیما (سورۂ احزاب، آیت: 59) ترجمہ: اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی صاحبزادیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے فرما دیں کہ اپنی چادروں کا ایک حصہ اپنے اوپر ڈالے رکھیں، یہ اس سے زیادہ نزدیک ہے کہ وہ پہچانی جائیں تو انہیں ستایا نہ جائے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(3) غزوۂ بدر کے قیدیوں کے بارے میں میری رائے تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے (فدیہ نہ لیا جائے) اللہ تعالیٰ

نے سورۂ انفال میں میری رائے کی تائید کردی، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ما کان لنبی ان یکون لہ۔۔۔۔ واللہ عزیز حکیم (سورۃ الانفال، آیت 59) ترجمہ: کسی نبی کو لائق نہیں کہ کافروں کو زندہ قید کرے جب تک زمین میں ان کا خون خوب نہ بہائے۔ تم لوگ دنیا کا مال چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ (بخاری، مسلم) اس روایت میں تین کا ذکر ہے، جس سے بقیہ کی نفی نہیں ہوتی، اسی تناظر میں حکیم الامت مولانا محمد اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ تقریباً بیس بائیس مقامات ایسے ہیں، جہاں فاروق اعظم کی رائے پروردگار کی منشا کے عین موافق تھی۔

عمرؓ کی ہجرتِ مدینہ:

ایک صبح نمازِ فجر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ ہجرت کا حکم دیا۔ عام خیال تھا کہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح رات کی تاریکی میں خفیہ طور پر مدینہ ہجرت کر جائیں گے، لیکن حضرت علی فرماتے ہیں کہ حکم ملتے ہی عمر گھر گئے، جسم پر ہتھیار سجائے، ہاتھ میں ننگی تلوار پکڑی اور تنِ تنہا خانہ کعبہ میں تشریف لائے۔ اس وقت مشرکین کے سردار اپنے قبیلے کے لوگوں کے ساتھ موجود تھے۔ حضرت عمر نے اطمینان کے ساتھ بیت اللہ کا سات بار طواف کیا۔ مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نفل ادا کیے۔ پھر ہاتھ میں تلوار پکڑ کر سردارانِ قریش کی مجلس میں تشریف لائے اور نہایت بارعب اور بلند آواز میں کہا اے دشمنانِ اسلام! تمہارے چہرے سیاہ ہوجائیں۔ اللہ تمہاری ناک خاک آلود کردے۔ جان لو! عمر مکے سے مدینہ ہجرت کر رہا ہے۔ تم میں سے جو شخص اپنی جان کا دشمن ہو، ماں کو روتا، بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم چھوڑے، وہ حرم سے باہر مجھ سے نبرد آزما ہوجائے۔ حضرت علی فرماتے ہیں: عمر کے رعب ودبدبے اور ہیبت کا یہ عالم تھا کہ کسی میں اپنی جگہ سے ہلنے اور انھیں روکنے کی ہمت نہ تھی۔

غزوات میں شرکت:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی اور بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دشمن بھی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ غزوۂ بدر میں اپنے سگے ماموں سمیت دیگر عزیز واقارب کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر کے دنیا بھر کو یہ پیغام دیا کہ اصل رشتہ، دین کا رشتہ ہے۔

خلافت:

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق نے جب محسوس کیا کہ اب آپ کا سفرِ آخرت قریب ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کے بعد خلافت کا معاملہ اختلاف کی نذر ہوجائے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کسی آزمائش میں مبتلا ہوجائے،

لہٰذا خود ہی خلیفہ مقرر کر دیا جائے۔ چونکہ حضرت ابوبکر صدیق کے نزدیک حضرت عمر کے مقابلے میں کوئی دوسرا شخص اس منصب کے لئے بہتر نہ تھا، چنانچہ آپ نے حضرت عبدالرحمن بن عوف کو، جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، بلا کر اس بارے میں، مشورہ چاہا۔ آپ نے فرمایا: جس قدر اُن کے بارے میں، آپ کا حسن ظن ہے، وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں، البتہ ان کے مزاج میں ذرا سختی ہے۔اس کے جواب میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ سختی اس لیے ہے کہ مجھ کو نرم دیکھتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جب ساری ذمے داری ان کے کندھوں پر آ جائے گی تو نرم پڑ جائیں گے۔ پھر آپ نے حضرت عثمان غنی سے، وہ بھی عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، اس بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے فرمایا: عمر کا باطن، عمر کے ظاہر سے بھی زیادہ اچھا ہے اور اب ہم میں ان کی مثل کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ بہر حال حضرت ابوبکر صدیق نے اپنی علالت کے دوران ہی حضرت عمر فاروقؓ کو خلیفہ مقرر کر دیا اور حضرت عثمان کے ہاتھ سے عہد نامۂ خلافت لکھوایا جو مجمع عام میں پڑھا گیا۔ (تاریخ طبری، طبقات، ازالۃ الخفاء)

خلافت کے بعد کے معمولات:

خلیفہ بننے کے بعد راتوں کو اٹھ کر رعایا کی خبر گیری کرتے، ان کی خدمت کرتے اور انہیں پتا بھی نہ چلتا کہ جو شخص رحمت کا فرشتہ بن کر رات کی تاریکیوں میں ان کے دکھوں کا مداوا کر رہا ہے، وہ کوئی اور نہیں، خود امیر المومنین، عمر بن خطاب ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا یا بکری کا بچہ بھی بھوکا مر گیا، تو روزِ قیامت، عمر سے جواب طلب ہوگا۔ اپنے دورِ خلافت میں عدل وانصاف کا ایسا نظام قائم کیا کہ شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پانی پینے لگے۔ زبان وبیان کی آزادی اور بے خوفی کا یہ عالم تھا کہ ایک بدو بھی بھری مجلس میں اٹھ کر سوال کر دیتا کہ امیر المومنین! آپ جو کرتا پہنے ہوئے ہیں، اس کے لیے کپڑا کہاں سے آیا، اور عظیم الشان مملکتِ اسلامیہ کا سربراہ، اس بدو کو مطمئن کرنے کا پابند تھا۔ آپ نے دنیا کو عدل سے بھر دیا۔ اس لیے پوری دنیا میں عدلِ فاروقی ہمیشہ کے لیے ضرب المثل بن گیا۔ حضرت فاروقِ اعظم کے دورِ خلافت میں بائیس لاکھ، اکیاون ہزار، تیس مربع میل رقبے پر اسلامی پرچم لہرایا گیا۔ خلافتِ اسلامیہ کی حدود، جزائرِ عرب سے باہر مصر، طرابلس سے مکران اور بلوچستان کے ساحلوں تک پھیل گئی تھیں۔ ایران اور روم کی ناقابلِ تسخیر سلطنتوں کا غرور وتکبر خاک میں مل چکا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق، خسرو پرویز کی سلطنت کے پرخچے اڑ گئے اور حضرت سراقہ بن مالک کو کسریٰ کے کنگن پہنائے گئے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سیدنا عمر کے دورِ خلافت میں جتنا رقبہ فتح کیا گیا، اتنا آج تک کسی عہدِ حکومت میں فتح نہیں ہوا۔ ایک یورپی مورخ نے لکھا ہے کہ اگر عمر (رضی اللہ عنہ) کچھ عرصہ مزید زندہ رہ جاتے، تو دنیا کا دو تہائی حصہ مسلمانوں کے زیرِ نگیں ہوتا۔

اولیاتِ فاروقیؓ: سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں عوامی فلاح وبہبود کے لیے مختلف شعبوں میں اصلاحات کیں اور کئی نئے ادارے بھی قائم کیے۔ مورخین ان اقدامات کو''اولیاتِ فاروقی'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ان میں چند درج ذیل ہیں:

(۱)۔آپ نے امیر المومنین کا لقب اختیار کیا۔ ۲۔مجلسِ شوریٰ کا قیام عمل میں لائے۔ ۳۔تاریخ اور سن ہجری جاری کیا۔ ۴۔سِکوں کا اجرا کیا۔ ۵۔بیت المال یعنی محکمۂ خزانہ قائم کیا۔ ۶۔باقاعدہ عدالتیں بنائیں اور قاضی مقرر کیے۔ ۷۔پولیس کا محکمہ قائم کیا، جیل خانے بنوائے۔ ۸۔فوجی چھاؤنیاں قائم کیں۔ ۹۔پیمائش کا طریقہ روشناس کروایا۔ ۱۰۔مردم شماری کا نظام بھی آپ ہی کا وضع کردہ ہے۔ ۱۱۔کوفہ، بصرہ اور موصل جیسے خوب صورت شہر بسائے۔ ۱۲۔بیواؤں، یتیموں، مساکین اور بچوں کے لیے وظیفے مقرر کیے۔مفلوک الحال غیر مسلموں تک کے لیے وظائف مقرر کیے۔ ۱۳۔آپ نے زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا ایسا مربوط نظام قائم کیا کہ ان کے دور میں زکوٰۃ دینے والے تو بہت تھے، لیکن لینے والا کوئی نہ تھا۔ ۱۴۔عدل وانصاف کا ایسا نظام وضع کیا جو پوری دنیا میں عدلِ فاروقی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ۱۵۔اشاعتِ دین اور تبلیغِ اسلام کے کام کو پوری دنیا میں پھیلایا، اس مقصد کے لیے مکاتب ومدارس قائم کیے اور اساتذہ کے لیے مشاہرے مقرر کیے گئے۔ ۱۶۔آپ ہی کے دور میں ائمہ مساجد اور مؤذنین کی تنخواہیں مقرر کی گئیں۔ ۱۷۔مساجد میں روشنی کا انتظام کیا اور مساجد میں وعظ کا طریقہ طے کیا۔ ۱۸۔مسجدِ حرام اور مسجدِ نبوی کی توسیع کروائی، مقامِ ابراہیم کی موجودہ جگہ پر منتقلی آپ کے حکم سے ہوئی، اس سے پہلے یہ کعبہ شریف سے متصل تھا۔ ۱۹۔آب رسانی کے نظام کو بہتر کیا۔نہریں کھدوائیں، مکہ سے مدینہ تک مسافروں کے آرام کے لیے چوکیاں، سرائے اور مسافر خانے بنوائے، راستوں کو کشادہ اور پکا کیا۔مفتوحہ ممالک میں صوبے بنائے۔ ریاستی نظام کو مضبوط کیا۔ ۲۰۔سزا اور جزا کے نظام میں اصلاح لائے تاکہ بے قصور کو سزا نہ ہو اور مجرم چھوٹ نہ پائے۔ ۲۱۔راتوں کو گشت کرکے رعایا کا حال معلوم کرنے کا طریقہ نکالا۔ ۲۲۔رضاکاروں کی تنخواہیں مقرر کیں۔ ۲۳۔آپ کسی شعبے کا سربراہ مقرر کرتے وقت اس شخص کے مال واسباب اور اثاثوں کی فہرست مرتب کرواتے۔ ۲۴۔وبائی امراض اور قحط کے دنوں میں رعایا کے آرام کے لیے بہترین انتظامات کیے۔ ۲۵۔بیت المقدس کو بغیر کسی جنگ کے، فتح کیا۔

احادیثِ طیبہ اور آثارِ صحابہؓ میں امیر المؤمنینؓ کے فضائل:

احادیثِ طیبہ اور آثارِ صحابہ میں امیر المؤمنین خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فضائل بیان ہوئے ہیں، ذیل میں چند احادیث کو نقل کیا جاتا ہے: ۱۔حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: بلاشبہ تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جنہوں نے خدا سے صرف ہم کلامی کا شرف پایا لیکن وہ نبی نہ ہوئے (ان کو محدث کہتے ہیں) میری امت میں اگر کوئی ایسا ہوتا تو وہ عمر ہوتے۔(صحیح بخاری) ۲۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر میرے بعد کوئی نبوت کا مقام پا سکتا تو وہ حضرت عمر ہوتے ۔(مستدرک حاکم)۔ ۳۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ عمر کی زبان پر حق کو رکھ دیا ہے، وہ حق بات ہی کہتے ہیں۔(مشکوٰۃ)۔ ۴۔سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جِن وانس کے شیاطین، عمر کو دیکھ کر راستہ بدل لیتے ہیں اور ڈر کر بھاگ جاتے ہیں۔(ترمذی)۔ ۵۔حضرت فضل بن عباس فرماتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا؛ عمر میرے ساتھ ہیں اور میں عمر کے ساتھ ہوں اور حق عمر کے ساتھ ہوگا جہاں کہیں بھی ہو۔(معجم طبرانی)۔ ٦۔حضرت سعد بن ابی وقاص اُن دس صحابہ کرام میں سے ہیں، جن کا جنتی ہونا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔آپ، حضرت عمر کے بارے میں کہتے ہیں: خدا کی قسم! حضرت عمر اسلام لانے میں گو ہم سے پہلے نہیں اور نہ ہی ہجرت کرنے میں ہم پر مقدم ہیں، مگر میں خوب جانتا ہوں کہ کس چیز کے سبب وہ ہم سے افضل ہیں؟ وہ ہم سے آگے اس لیے بڑھ گئے کہ وہ سب سے زیادہ دنیا سے بے تعلق تھے۔(ازالۃ الخفاء)۔ ۷۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص بھی رسول اللہ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث لکھنے کی سب سے زیادہ سعادت آپ کو نصیب ہوئی۔آپ حضرت عمر کے بارے میں فرماتے ہیں: حضرت عمر بہت بڑے آدمی تھے۔ میں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق کے بعد حضرت عمر سے زیادہ خوف خدا رکھنے والا کسی کو نہیں پایا۔(کنز العمال)

شہادت کا دل خراش سانحہ:

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اللہ سے دعا کی تھی کہ اے اللہ! مجھے اپنے راستے میں شہادت عطا فرما اور اپنے محبوب کے شہر(مدینے) میں موت عطا فرما۔(بخاری)۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا من وعن قبول فرمائی، چنانچہ 26 ذی الحجہ، 23 ہجری کی ایک صبح، جب آپ نمازِ فجر کی امامت کر رہے تھے، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے پارسی غلام، ابولولو فیروز مجوسی نے زہر سے بجھے دو دھاری خنجر سے آپ پر وار کیے۔آپ نے زخمی ہو کر نیچے گرنے سے پہلے، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کو کھینچ کر اپنی جگہ کیا اور گر کر بے ہوش ہو گئے۔ابولولو ملعون نے بھاگتے ہوئے مزید 12 افراد کو زخمی اور 6 کو شہید کر دیا۔لوگوں نے گھیر کر اسے پکڑا، تو اس نے خودکشی کر لی۔جب سیدنا عمرؓ پر حملہ کیا گیا تو ان کے لیے دودھ لایا گیا، جیسے ہی آپ نے دودھ پیا تو وہ آپ کی پسلیوں کے زخم سے بہہ

نکلا۔طبیب نے ان سے کہا: اے امیر المومنین وصیت فرما دیں، آپ زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکیں گے۔تو انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کو بلایا اور کہا کہ حذیفہ بن الیمان کو میرے پاس بلاؤ۔حذیفہ بن الیمان حاضر ہو گئے۔ یہ وہ صحابی ہیں جنہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے ناموں کی فہرست عطا کی تھی اور ان ناموں کے بارے میں اللہ پاک اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور حذیفہ بن الیمان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔حضرت عمرؓ نے پوچھا جبکہ خون ان کی پسلیوں سے بہہ رہا تھا، کہ اے حذیفہ بن الیمان میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں! کیا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام منافقین کے ناموں میں لیا ہے یا نہیں؟ یہ سن کر حذیفہ بن الیمان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا! یہ میرے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا راز ہے جو کسی کو نہیں بتا سکتا۔آپ نے پھر پوچھا! خدا کے لیے مجھے اتنا بتا دیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام شامل کیا ہے یا نہیں؟ حذیفہ بن الیمان کی ہچکی بندھ گئی اور کہتے ہیں اے عمرؓ! میں صرف آپ کو بتا رہا ہوں اگر آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں کبھی بھی اپنی زبان نہ کھولتا اور وہ بھی صرف اتنا بتاتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں آپ کا نام شامل نہیں کیا۔حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا کہ دنیا میں میرے لیے ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔حضرت عبداللہ نے پوچھا وہ کیا ہے ابا جان؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا! بیٹا میں جوار رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں دفن ہونا چاہتا ہوں۔لہٰذا ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے پاس جاؤ، ان سے یہ مت کہنا کہ امیر المؤمنین عمر بلکہ کہنا کہ کیا آپ عمر کو اپنے ساتھیوں کے قدموں میں دفن ہونے کی اجازت دیتی ہیں؟ کیونکہ آپ اس گھر کی مالکن ہیں۔تو ام المؤمنین نے جواب دیا کہ یہ جگہ تو میں نے اپنے لیے تیار کر رکھی تھی لیکن آج میں اسے عمر کے لیے ترک کرتی ہوں۔عبداللہ ابنِ عمرؓ شاداں و فرحان واپس آئے اور عرض کی، اجازت مل گئی ہے۔عبداللہ ابنِ عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ کا رخسار مٹی پر پڑا ہے تو انہوں نے آپ کا چہرہ اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا۔حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ کیوں تم میرا چہرہ مٹی سے بچانا چاہتے ہو۔عبداللہ ابنِ عمرؓ نے کہا ابا جان لیکن حضرت عمرؓ نے بات کاٹتے ہوئے فرمایا کہ اپنے باپ کا چہرہ مٹی سے لگنے دو۔ بربادی ہے عمر کے لیے اگر کل اللہ پاک نے اسے نہ بخشا۔حضرت عمرؓ اپنے بیٹے کو یہ وصیت فرما کر موت کی آغوش میں چلے گئے،،، اے میرے بیٹے میری میت مسجد نبوی میں لے جانا اور میرا جنازہ پڑھنا اور حذیفہ بن یمان پر نظر رکھنا اگر وہ میرے جنازے میں شرکت کرے، تو میری میت روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے جانا۔اور میرا جنازہ روضۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر رکھ کر دوبارہ اجازت طلب کرنا اور کہنا،،، اے ام المؤمنین آپ کا بیٹا عمر یہ مت کہنا کہ امیر المؤمنین، ہوسکتا ہے میری زندگی میں مجھ سے حیا کی وجہ سے اجازت دی گئی ہو، اگر اجازت مرحمت فرما دیں تو دفن کرنا ورنہ مجھے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر

دینا۔حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ کی نظریں حضرت حذیفہ بن الیمان پر تھیں۔وہ کہتے ہیں کہ میں حذیفہ بن یمان کو ابا جان کی نماز جنازہ پر دیکھ کر بہت خوش ہوا اور ہم جنازہ لے کر روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے گئے۔ دروازے پر کھڑے ہوکر میں نے کہا”اے ہماری ماں آپ کا بیٹا عمر دروازے پر ہے،کیا آپ تدفین کی اجازت دیتی ہیں؟ام المؤمنین نے جواب دیا!مرحبا یا عمر۔عمر کو اپنے ساتھیوں کی ساتھ دفن ہونے پر مبارک ہو۔ام المؤمنین نے اپنی چادر سمیٹی اور روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے باہر نکل آئیں۔اللہ پاک راضی ہو حضرت عمرؓ سے زمین کا چپہ چپہ جن کے عدل کی گواہی دیتا ہے،جن کی موت سے اسلام یتیم ہوگیا،جن کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی میں جنت کی خوشخبری دی ہو پھر بھی اللہ کے سامنے حساب دہی اتنا خوف ہمارا کیا بنے گا؟

نماز جنازہ وتدفین:

وصیت کے مطابق حضرت صہیب رومی نے نماز جنازہ پڑھائی اور آپ کی خواہش کے مطابق،حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی اجازت سے روضۂ رسول میں سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ آپ ساڑھے دس سال تک مسلمانوں کے خلیفہ رہے۔

حقیقی نفع کس طرف ہے؟

ہم جس مستقبل کے پیچھے دوڑتے ہیں،وہ کبھی آتا ہی نہیں،کیونکہ جو دن آتا ہے وہ حال بن جاتا ہے،اور ہم پھر نئے مستقبل کی تلاش میں لگ جاتے ہیں۔سچا مستقبل آخرت ہے،لیکن ہم میں سے کون اس کے لیے عمل کرتا ہے؟دنیا کی لذتیں سراب کی مانند ہیں،جیسے دکھائی دیتی ہیں،ویسی حاصل نہیں ہوتیں۔دنیا کے لذتیں صرف ایک ذائقہ ہیں،اصل تسکین آخرت میں ہے۔دنیا کا ہر ذائقہ لمحاتی ہے،جبکہ آخرت کی لذت دائمی ہے۔ہم زندگی کو ایک سفر کی مانند گزار رہے ہیں،جیسے مسافر ہوائی جہاز میں سوار ہو،آرام دہ نشست،مزیدار کھانے، حسین مناظر،لیکن اصل منزل کی تیاری نہ ہو۔بہتر ہوتا کہ وہ کچھ تکلیفیں برداشت کرتا،مگر منزل کی تیاری کرتا۔ زندگی کا سفر بھی ایسا ہی ہے،کیا ہم نے آخرت کی تیاری کی ہے؟زندگی ایک دوڑ ہے پیسے کی،عہدوں کی،لذتوں کی۔لیکن آخر میں ہم سب کچھ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔تو کیا بہتر نہیں کہ ہر سال کے آغاز پر ہم اپنا محاسبہ کریں، اپنا جائزہ لیں،اور سمجھیں کہ حقیقی نفع کس طرف ہے؟۔(شیخ علی طنطاوی)

اہلِ بیتِ اطہار رضی اللہ عنہم، تذکرہ ومختصر تعارف

مولانا مفتی عبدالصمد ساجد

''اہلِ بیت'' کا معنی ہے: گھر والے، جیسے کہا جاتا ہے: ''اہلِ مکہ'' مکہ والے، ''اہلِ علم'' علم والے، گھر والوں میں سب سے پہلے بیویاں آتی ہیں، اس لیے اہلِ بیت میں سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیویاں (ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن) داخل ہیں، سورۂ احزاب کی آیتِ تطہیر ''إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ'' بھی ازواجِ پیغمبر رضی اللہ عنہن کے حق میں اُتری، جیسا کہ آگے پیچھے کی تمام آیات سے واضح ہے۔ (روح المعانی)

صحابیِ رسول حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

''نساءہ من أهل بيته'' کہ ''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں آپ کے اہل بیت ہیں۔'' (تفسیر ابن کثیر، ج:۳، ص:۵۰۲۔ کنز العمال، ج:۱۱، ص:۵۸۶)

علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

''وهذا نص في دخول أزواج النبي صلى الله عليه وسلم في أهل البيت رضى الله عنهم هاهنا۔'' (تفسیر ابن کثیر)

''یہ آیت ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے اہل بیت میں داخل ہونے پر نص ہے۔''

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ تحریر فرماتے ہیں:

''چونکہ آگے پیچھے سارا ذکر ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا چل رہا ہے، اس لیے وہ تو اہلِ بیتؓ میں براہِ راست داخل ہیں، لیکن الفاظ کے عموم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیاں اور ان کی اولاد بھی داخل ہیں۔'' (آسان ترجمہ قرآن، تفسیر آیۂ تطہیر)

البتہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بچوں کو بھی چادر میں لے کر اہلِ بیتؓ کی اس تطہیر وتقدس میں شامل فرمایا، چنانچہ درج ذیل روایت ملاحظہ فرمائیں:

''عَنْ عَائِشَةَ رضي الله عنها قَالَتْ: خَرَجَ النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم غَدَاةً وَعَلَيْهِ مِرْطٌ مُرَحَّلٌ، مِنْ شَعْرٍ

اَسْوَدَ. فَجَاءَ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ رضي الله عنهما فَاَدْخَلَهٗ، ثُمَّ جَاءَ الْحُسَيْنُ رضي الله عنه فَدَخَلَ مَعَهٗ، ثُمَّ جَاءَتْ فَاطِمَةُ رضي الله عنها فَاَدْخَلَهَا، ثُمَّ جاءَ عَلِيٌّ رضي الله عنه فَاَدْخَلَهٗ ثُمَّ قَالَ: ''إِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰہُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا''(الاحزاب:۳۳) (صحیح مسلم)

''حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کے وقت ایک اونی منقش چادر اوڑھے ہوئے باہر تشریف لائے تو آپ کے پاس حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں اُس چادر میں داخل کر لیا، پھر حضرت حسین رضی اللہ عنہ آئے اور وہ بھی ان کے ہمراہ چادر میں داخل ہو گئے، پھر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا آئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی اس چادر میں داخل کر لیا، پھر حضرت علی کرم اللہ وجہہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنہیں بھی چادر میں لے لیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیتِ مبارکہ پڑھی: اے اہلِ بیت! اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتا ہے کہ تم سے (ہر طرح کی) آلودگی دُور کر دے اور تم کو (گناہوں سے) خوب پاک وصاف کر دے۔''

''عَنْ سَعْدِ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ رضي الله عنه قَالَ: لَمَّا نَزَلَتْ هٰذِهِ الاٰيَةُ: (فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَكُمْ)،(آل عمران،:۶۱)،دَعَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلِيًّا وَ فَاطِمَةَ وَ حَسَنًا وَ حُسَيْنًا فَقَالَ: اللّٰهُمَّ، هٰؤُلَاءِ اَهْلِيْ۔'' (صحیح مسلم، جامع ترمذی)

''حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جب آیتِ مباہلہ نازل ہوئی، یعنی: ''آپ فرما دیں: آؤ! ہم بلائیں اپنے بیٹے اور تمہارے بیٹے۔'' تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہم کو بلایا، پھر فرمایا: یا اللہ! یہ میرے اہل (بیت) ہیں۔''

اس حدیث کو''حدیثِ کساء'' کہا جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر (کساء) میں حضرت علی المرتضیٰ کرّمَ اللہ وَجْہَہٗ کو بھی لیا اور اہلِ بیت میں داخل فرمایا، کیونکہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بچوں کے حکم میں ہیں، ان کی پرورش آغوشِ نبوت میں ہوئی، چنانچہ نصاریٰ نجران کے خلاف مباہلہ میں بھی اُن کو لے گئے۔ آیتِ مباہلہ میں ''أَبْنَاءَ نَا'' کے الفاظ میں سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ داخل وشامل ہیں، جیسا کہ معارف القرآن میں حضرت مفتی محمد شفیع عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

اہلِ بیت کی تیسری قسم وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اعزازی طور پر اپنے اہلِ بیت میں شامل فرمایا، جیسا کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا کہ:

''سَلْمَانُ مِنَّا اَهْلَ الْبَیْتِ۔'' (مستدرک حاکم) ''سلمان ہمارے اہل بیت میں سے ہیں۔''

خلاصہ یہ ہے کہ اہلِ بیت اطہار میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیویاں، آپ کی اولاد (تین بیٹے اور چار بیٹیاں) اور اولاد کی اولاد (پانچ نواسے اور تین نواسیاں) حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ اور دیگر وہ شخصیات شامل ہیں، جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ بیت کے مفہوم میں داخل فرمایا۔ اہلِ بیت کا لفظ بولتے ہی ہمارا ذہن جو صرف خاندانِ سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی طرف جاتا ہے، یہ شیعی تاثر معلوم ہوتا ہے اور غلط فہمی پر مبنی ہے، کیونکہ شیعہ کے نزدیک اہلِ بیت صرف حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے گھرانے کے لوگ ہیں، اسی لیے انہوں نے پنجتن پاک کا نعرہ لگایا، ھدانا اللہ الی الصراط المستقیم۔

محبتِ اہلِ بیتِ اطہار رضی اللہ عنہم:

''عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: اَحِبُّوْا اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ مِنْ نِعَمِہٖ، وَاَحِبُّوْنِیْ بِحُبِّ اللّٰہِ عزوجل وَاَحِبُّوْا اَھْلَ بَیْتِیْ لِحُبِّیْ۔'' (جامع ترمذی)

''حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے محبت کرو ان نعمتوں کی وجہ سے جو اس نے تمہیں عطا فرمائیں اور مجھ سے محبت کرو اللہ کی محبت کے سبب اور میری محبت کی وجہ سے اہلِ بیتؓ سے محبت کرو۔''

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میرے اہلِ بیت کی مثال حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کی سی ہے، جو اس میں سوار ہوگیا وہ نجات پا گیا اور جو اس سے پیچھے رہ گیا وہ غرق ہوگیا۔'' (المعجم الکبیر للطبرانی)

''عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضی اللہ عنہ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ: مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّکْتَالَ بِالْمِکْیَالِ الْاَوْفٰی إِذَا صَلّٰی عَلَیْنَا اَھْلَ الْبَیْتِ، فَلْیَقُلْ: اللّٰھُمَّ، صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ النَّبِیِّ وَاَزْوَاجِہٖ اُمَّھَاتِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ ذُرِّیَّتِہٖ وَاَھْلِ بَیْتِہٖ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی إِبْرَاھِیْمَ إِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔'' (سنن ابی داؤد)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جسے یہ خوشی حاصل کرنا ہو کہ اس کے نامۂ اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے، جب وہ ہم اہلِ بیت پر درود بھیجے تو اسے چاہیے کہ یوں کہے: اے اللہ! تو درود بھیج حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات امہات المومنین پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت اور اہل بیت پر، جیسا کہ تو نے درود بھیجا حضرت ابراہیم (علیہ السلام) پر، بے شک تو بہت زیادہ تعریف کیا ہوا اور بزرگی والا رب ہے۔''

سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''ارْقُبُوْا مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اَھْلِ بَیْتِہٖ۔'' (صحیح بخاری: ۳۷۱۳)

''اہل بیتؓ کا اکرام وتعظیم کرکے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال اور لحاظ رکھو۔''

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''لكل شيء أساس و أساس الإسلام حب أصحاب رسولِ الله صلى الله عليه وسلّم و حبّ أهل بيته۔'' (کنز العمال)

''ہر چیز کی ایک بنیاد ہوتی ہے اور اسلام کی اَساس و بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت سے محبت کرنا ہے۔''

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک آنکھ اور اہلِ بیت اطہار رضی اللہ عنہم دوسری آنکھ ہیں، ایک کو چھوڑ دیں تو بھی اپنا نقصان ہے اور اگر دوسری آنکھ کو چھوڑیں تو بھی اپنا نقصان ہے، نیز اگر کسی خوب صورت نقش نین والے شخص کی بھی ایک آنکھ خراب ہوجائے تو دوسری آنکھ کا حسن بھی ختم ہوجاتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے الفاظ یہ ہیں:

''راہ کی بات یہ ہے کہ ہم کو دونوں فریق (صحابہ کرام اور اہل بیت کرام رضی اللہ عنہم) بمنزلہ دو آنکھوں کے ہیں، کس کو چھوڑیں؟ جس کو چھوڑیں اپنا ہی نقصان ہے، بلکہ جیسے کوئی حسین متناسب الاعضاء ہو کہ اس کی آنکھ ناک سب کی سب مناسب اور متناسب ہوں اور پھر اس کی ایک آنکھ بیٹھ جائے تو دوسری آنکھ کی زیب بھی جاتی رہے گی۔'' (ہدیۃ الشیعہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن:

1- حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۵ برس کی عمر میں مکہ میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی۔ اس طرح حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا پہلی خاتون تھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں۔ ان کا نام خدیجہ اور لقب طاہرہ تھا۔ والد کا نام خویلد اور والدہ کا نام فاطمہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے سے قبل ان کا نکاح پہلے ابو ہالہ بن بناش تمیمی سے ہوا تھا۔ ان کے بعد عتیق بن عابد مخزومی کے نکاح میں آئیں۔ ان کے انتقال کے بعد ۴۰ برس کی عمر میں حرمِ نبوت میں داخل ہوئیں اور ام المؤمنین کا شرف حاصل ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملی تو نبوت کی تصدیق کے ساتھ ساتھ سب سے پہلے اسلام لانے کی سعادت انہوں نے ہی حاصل

کی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آنے کے بعد ۲۵ ر برس تک زندہ رہیں۔نبوت کے دسویں سال انتقال کیا۔

2-حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے انتقال کے بعد حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے شادی کی، جو قریش کے ایک قبیلے عامر بن لوی سے تعلق رکھتی تھیں۔ان کی پہلی شادی سکران بن عمرو سے ہوئی تھی، جن کا انتقال ہو گیا تو ۷ ر رمضان (بعض روایات میں شوال) سن ۱۰ نبوی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں آئیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں انتقال کیا۔سخاوت وفیاضی ان کے نمایاں اوصاف تھے۔

3- حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا:

سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔والدہ کا نام زینب تھا،جن کی کنیت ام رومان ہے۔ ان کا نام عائشہ، لقب صدیقہ اور کنیت ام عبداللہ تھی۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سن ۱۱ ر نبوی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا اور ۱ ر ہجری میں ان کی رخصتی ہوئی۔رخصتی کے وقت ان کی عمر نو برس تھی۔انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نو برس گزارے۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے ۴۸ سال بعد ۶۷ برس کی عمر رمضان المبارک ۵۸ھ میں سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں انتقال ہوا۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو علمی حیثیت سے عورتوں میں سب سے زیادہ فقیہ اور صاحبِ علم ہونے کی بنا پر چند صحابہ کرامؓ پر بھی فوقیت حاصل تھی۔فتویٰ دیتی تھیں اور بے شمار احادیث ان سے مروی ہیں۔

4- حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہا:

خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تھیں۔والدہ کا نام زینب بنت مظعون رضی اللہ عنہا تھا۔ غزوۂ بدر میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے شوہر حضرت خنیس رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا۔ ۴۵ھ میں مدینہ میں انتقال کیا۔

5- حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا:

اُم المساکین سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے والد کا نام خزیمہ تھا۔اُم المساکین کنیت تھی،فقراء اور مساکین کے ساتھ فیاضی کرتی تھیں، اس لیے اس کنیت سے مشہور ہو گئیں۔پہلے شوہر حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ تھے جو غزوۂ احد میں شہید ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا،لیکن صرف دو تین ماہ کے بعد ہی تیس (۳۰) سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔

6- حضرت اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا:

ان کا نام ہند اور کنیت ام سلمہ تھی۔ پہلے ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسد رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں دونوں اسلام لائے تھے۔ حبشہ اور مدینہ ہجرت بھی کی تھی۔ حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ احد میں زخمی ہوئے اور شہید ہو گئے تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا۔ علمی اعتبار سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بعد آپ کا نمبر آتا تھا۔ بہت سی احادیث ان سے مروی ہیں۔ سن ۶۳ ھ (واقعۂ حرہ کے سال) ۸۴ ربرس کی عمر میں انتقال ہوا۔ سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئیں۔

7- حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا:

نام زینب اور کنیت ام الحکم تھی۔ والد کا نام جحش بن رباب اور والدہ کا نام اُمیمہ بنت عبدالمطلب تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی تھیں۔ اس طرح حضرت زینب رضی اللہ عنہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی زاد تھیں۔ آپ کی دو بیوہ بھابھیاں بھی ازواج مطہراتؓ میں تھیں۔ (ام حبیبہ جو عبیداللہ بن جحش کی بیوہ تھیں اور زینب بنت خزیمہ جو عبداللہ بن جحشؓ کی بیوہ تھیں)۔

حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے ہوا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے، دونوں کے تعلقات خوشگوار نہ رہ سکے اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے طلاق دے دی۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا ذکر مبارک قرآن مجید میں نام کے ساتھ آیا ہے اور آپ واحد صحابی رسول ہیں جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے۔ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح کیا۔ ان کا انتقال ۲۰ ھ ۵۳ رسال کی عمر میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ہوا۔

8- حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا:

بنی مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا پہلا نکاح مسافع بن صفوان (ذی شفر) سے ہوا تھا، جو ان کے قبیلے سے تھا، لیکن غزوۂ مریسع میں قتل ہو گیا تو مسلمانوں کے ہاتھ آنے والے لونڈی و غلاموں میں حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا بھی تھیں اور مالِ غنیمت کی تقسیم میں ثابت بن قیس کے حصے میں آئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رقم دے کر آزاد کرایا اور ان سے نکاح کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے بعد بنی مصطلق قبیلہ کے دیگر لونڈی غلام بھی آزاد کر دیئے گئے۔

حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ۶۵ رسال کی عمر میں ربیع الاول ۵۰ ھ میں ہوا۔

9- حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا:

ان کا اصل نام رملہ تھا۔ حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور سیدنا معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہما کی ہمشیرہ تھیں۔ والدہ صفیہ بنت العاص تھیں، جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پھوپھی تھیں۔ پہلا نکاح عبید اللہ بن جحش سے ہوا اور مسلمان ہوئیں، حبشہ ہجرت بھی کی۔ عبید اللہ نے اسلام چھوڑ کر مسیحیت اختیار کر لی تو آپؓ نے اُس سے علیحدگی اختیار کر لی، پھر عبید اللہ کا انتقال بھی وہیں حبشہ میں ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے پاس عمرو بن امیہ کو نکاح کے پیغام کے لیے بھیجا، نجاشی نے خود نکاح پڑھایا اور امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا مدینہ آ گئیں۔ سن ۴۴ھ میں تہتر برس کی عمر میں اپنے بھائی سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں انتقال ہوا۔

10- حضرت صفیہ بنت حی بن اخطب رضی اللہ عنہا:

ان کا اصل نام زینب تھا، جو غزوۂ خیبر کے قیدیوں میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حصے میں آئی تھیں جو قبیلہ بنو نضیر کے سردار حی بن اخطب کی بیٹی تھیں، ان کی ماں بھی رئیسِ قریظہ کی بیٹی تھیں۔ ان کی پہلی شادی مشکم القرظی سے ہوئی، اس سے طلاق کے بعد کنانہ بن ابی الحقیق کے نکاح میں آئیں جو جنگ خیبر میں قتل ہوا۔ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آزاد کر کے نکاح کیا۔ رمضان المبارک ۵۰ھ میں ۶۰ رسال کی عمر میں انتقال کیا۔

11- حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا:

ان کے والد کا نام حارث بن حزن تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح سے قبل مسعود بن عمیر ثقفی سے نکاح ہوا، ان سے علیحدگی کے بعد ابورہم بن عبدالعزیٰ کے نکاح میں آئیں، جن کی ۷ھ میں وفات ہوئی اور ۷ھ میں ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ عمرہ کے دوران مقامِ سرِف پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نکاح ہوا اور سفرِ عمرہ سے واپسی پر یہیں مقامِ سرِف پر رخصتی اور عروسی ہوئی، اور عجیب اتفاق کہ یہیں مقامِ سرف میں سن ۵۱ھ میں انتقال فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں:

1- سیدہ زینب رضی اللہ عنہا:

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی ہیں، بعثتِ نبوی سے دس سال قبل پیدا ہوئیں، ان کا نکاح اپنے خالہ زاد حضرت ابوالعاص لقیط بن ربیع رضی اللہ عنہ سے ہوا۔

۸ رہجری میں اکتیس سال کی عمر میں وفات پائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی، خود قبر مبارک میں اُترے اور اپنی لختِ جگر کو حزن و ملال کے ساتھ قبر میں اُتارا۔ (طبقات ابن سعد)

سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کا ایک بیٹا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک بیٹی سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

2- سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا:

یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی ہیں، ان کا نکاح حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ سن ۲ھ میں جب غزوۂ بدر ہوا، انہی دنوں میں وفات پائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انہی کی دیکھ بھال کی وجہ سے غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعزازاً اُن کو بدریین میں شامل فرمایا اور غنائم سے حصہ بھی دیا۔

سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا کا ایک بیٹا ہوا، جس کا نام عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا۔

3- سیدہ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہا:

حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد سن ۳ھ میں ان کا نکاح بھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ چھ برس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہیں، سن ۹ھ میں رحلت فرمائی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت صدمہ پہنچا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود نمازِ جنازہ پڑھائی، تدفین کے بعد قبر پر بیٹھے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

4- سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے چھوٹی، لاڈلی اور چہیتی صاحبزادی ہیں، نام فاطمہ اور لقب زہراء ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''فاطمہ میرے جسم کا ٹکڑا ہے۔'' اور فرمایا کہ: ''فاطمہ جنتی عورتوں کی سردار ہے۔'' (صحیح بخاری)

ان کا نکاح پندرہ یا اٹھارہ سال کی عمر میں ذی الحجہ سن ۲ھ میں حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے چھ ماہ بعد ۳؍رمضان المبارک سن ۱۱ھ میں وفات پائی۔ سیدنا ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی بیوی حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے غسل دیا، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی اور بعض روایات کے مطابق سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جنازہ پڑھایا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پانچ بچے ہوئے، تین بیٹے: حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت محسن رضی اللہ عنہم۔ دو بیٹیاں: سیدہ زینب اور سیدہ اُمِ کلثوم رضی اللہ عنہما۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تین صاحبزادے تھے:

1- حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ

ان کو طیب اور طاہر بھی کہتے ہیں۔ بچپن میں انتقال کر گئے۔

2- حضرت قاسم رضی اللہ عنہ

انہی کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم تھی۔ بچپن میں وفات پا گئے۔

3- حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطن سے تھی، صرف حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی باندی حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا سے تھے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۸ھ میں ہوئی، مدینہ منورہ کے قریب مقامِ عالیہ کے اندر حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کے شکم مبارک سے پیدا ہوئے، اس لیے مقامِ عالیہ کا دوسرا نام مشربۂ ابراہیم بھی ہے۔ ان کی ولادت کی خبر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام ابورافع رضی اللہ عنہ نے مقامِ عالیہ سے مدینہ آکر بارگاہِ اقدس میں سنائی۔ یہ خوش خبری سن کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انعام کے طور پر حضرت ابورافع رضی اللہ عنہ کو ایک غلام عطا فرمایا، ان کے سر کے بال کے وزن کے برابر چاندی خیرات فرمائی اور ان کے بالوں کو دفن کرادیا اور ابراہیم نام رکھا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: ''میں نے اپنے اہل وعیال پر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بڑھ کر کسی کو شفیق نہیں پایا، حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ عوالیِ مدینہ میں دودھ پیتے بچے تھے، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) انہیں ملنے جایا کرتے تھے، ہم بھی نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہوتے، نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جب اس گھر میں داخل ہوتے تو وہ دھوئیں سے بھرا ہوتا تھا، (کیونکہ خاتونِ خانہ کا شوہر لوہار تھا) نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) انہیں پکڑ کر پیار کرتے اور کچھ دیر بعد واپس آجاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹوں میں سب سے زیادہ عمر انہوں نے پائی، تقریباً ڈیڑھ پونے دوسال کی عمر میں وفات پائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ جنازہ پڑھائی، اور جنت البقیع میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر کے پاس دفن فرمایا اور اپنے دستِ مبارک سے ان کی قبر پر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ (اسد الغابہ، ج:۱، ص:۴۹)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پانچ نواسے:

1- حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما

جنت کی عورتوں کی سردار حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے سب سے بڑے صاحبزادے ہیں، سن ۳ھ میں پیدا ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا نام حسن رکھا، ساتویں دن ان کا عقیقہ کیا، ان کے بال مونڈوائے اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کی۔ صحابیِ رسول، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لاڈلے نواسے، جنتی جوانوں کے سردار، گلشنِ نبوت کے گلِ سرسبد اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھے۔ (اسد الغابہ)

سیدہ خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کی گود جب سبطِ رسول خوشبوئے نبوت سے مہکی تو آنحضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لائے، نومولود کو اپنے دستِ مبارک میں اُٹھایا، گھٹی دی، لعابِ دہن منہ میں ڈالا اور خوب صورت نام ''حسن'' رکھا۔ نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے کان میں اذان دی اور ساتویں روز عقیقہ کیا۔ (الاستیعاب، اسد الغابہ)

آپ کا اسم سامی حسن، کنیت ابو عبداللہ اور ''سید شباب أہل الجنۃ'' (اہلِ جنت کے سردار) اور ''ریحانۃ النبي'' (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خوشبودار پھول/خوشبوئے نبوت) لسانِ نبوت سے ملے ہوئے القاب ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ ''خامس أہل الکساء'' ہیں، یعنی ان پانچ مبارک شخصیات میں سے ہیں، آیتِ تطہیر اُترنے کے بعد جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ تطہیر کے مصداق میں داخل اور شامل فرمایا۔ (اسد الغابہ، ج:۱، ص:۴۹۶)

''سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک بار سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو کھیلتے ہوئے دیکھا تو پیار سے اُن کو کندھوں پر اُٹھالیا اور فرمایا کہ: حسن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہیں، علی (رضی اللہ عنہ) کے مشابہ نہیں ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ دیکھ کر اور سن کر ہنس رہے تھے۔'' (صحیح البخاری، رقم: ۳۵۴۲، ۳۷۵۰)

رمضان المبارک سن ۴۰ھ میں خلیفۂ راشد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی، تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے، تقریباً چھ ماہ بعد کاتبِ وحی سیدنا معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ساتھ صلح کر لی اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی، اپنے ساتھیوں کو بھی حکم ارشاد فرمایا کہ سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرلیں، یوں آپ کی بدولت اُمت کے دو منتشر گروہ جمع ہوگئے، اسلامی اتحاد کی ایک مضبوط شکل قائم ہوئی، اُمت کا بکھرا شیرازہ مجتمع ہوگیا، تمام امت ایک امیر اور امام عادل سیدنا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے امر کے تحت جمع ہوگئی اور اس سال کو ''عام الجماعۃ'' (اتحاد و اتفاق کا سال) قرار دیا گیا۔ صلح کے بعد سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ دونوں حضرات سواری پر بیٹھ کر کوفہ میں داخل ہوئے۔ (البدایہ

والنہایہ، سیر اعلام النبلاء)

یہ دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی پوری ہوئی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی:

''إِنَّ ابْنِيْ هٰذَا سَيِّدٌ وَلَعَلَّ اللّٰهَ اَنْ يُصْلِحَ بِهٖ بَيْنَ فِئَتَيْنِ عَظِيْمَتَيْنِ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔'' (صحیح البخاری، رقم: ۲۷۰۴، ۳۶۲۹، ۳۷۴۶)

''میرا یہ سردار بیٹا مسلمانوں کی دو عظیم جماعتوں میں صلح کرائے گا۔''

مشہور قول کے مطابق حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا انتقال ربیع الاول ۴۹ھ میں ۴۶ سال کی عمر میں ہوا۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بیٹوں کے نام یہ ہیں: حسن (حسن مثنیٰ)، زید، عمر، قاسم، عبداللہ، ابوبکر، عبدالرحمٰن، حسین، طلحہ۔ پانچ بیٹیوں کے نام: فاطمہ، رقیہ، اُم سلمہ، ام عبداللہ، ام الخیر ہیں۔ رحمہم اللہ اجمعین

عمرؒ، قاسمؒ اور عبداللہؒ میدانِ کربلا میں شہید ہوئے۔

2- حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما

سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ جنت کی عورتوں کی سردار حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور خلیفۂ راشد سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے دوسرے صاحبزادے ہیں، آپ صحابیِ رسول، نواسۂ رسول، باغِ نبوت کے مہکتے پھول، جنتی جوانوں کے سردار اور شہیدِ کربلا ہیں، شکل وصورت میں اپنے والد سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے مشابہ تھے اور بدن مبارک حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن کے مشابہ تھا۔ (جامع الترمذی، رقم: ۳۷۷۹، البدایۃ والنہایۃ، اسد الغابۃ)

آپ کا اسم سامی حسین، کنیت ابوعبداللہ اور ''سید شباب أہل الجنۃ'' (اہلِ جنت کے سردار) اور ''ریحانۃ النبي'' (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خوشبودار پھول/خوشبوئے نبوت) لسانِ نبوت سے ملے ہوئے القاب ہیں۔ آپ کی تاریخِ پیدائش میں مؤرخین کے مختلف اقوال ہیں، مشہور قول ۴ ہجری ہے۔ جنت کی عورتوں کی سردار حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی گود جب سبطِ رسول خوشبوئے نبوت سے مہکی تو آنحضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس تشریف لائے، نومولود کو اپنے دستِ مبارک میں اُٹھایا، گھٹی دی، لعابِ دہن منہ میں ڈالا اور خوب صورت نام ''حسین'' رکھا۔ نیز رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے کان میں اذان دی اور ساتویں روز عقیقہ کیا۔ (مستدرکِ حاکم، رقم: ۴۸۲۷۔ المعجم الکبیر: ۹۲۶۔ ابن کثیر، ج: ۸، ص: ۱۶۰)

حضرت حسین رضی اللہ عنہ ''خامس أهل الكساء'' ہیں، یعنی ان پانچ مبارک شخصیات میں سے ہیں، جن کو

آیتِ تطہیر اُترنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیتِ تطہیر کے مصداق میں داخل اور شامل فرمایا۔

(اسد الغابہ، ج:۱،ص:۴۹۶)

مؤرخ ابن کثیرؒ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم آپ کی تکریم وتعظیم کیا کرتے تھے، (باوجودیکہ اس وقت تک حضرت حسین رضی اللہ عنہ صغیر السن تھے، مگر یہ جانثارانِ رسول قرابتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کیوں کر لحاظ نہ کرتے؟) پھر آپؓ اپنے والد گرامی قدر حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے ساتھ رہے، ان کے ساتھ جنگوں میں شرکت کی، مشاجرۂ جمل اور صفین میں بھی شرکت کی، والد ماجد کی بہت توقیر کرتے تھے، ان کی شہادت تک اطاعت گزاری کی، پھر مصالحتِ سیدنا حسن با سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہما کو بھی تسلیم کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ان دونوں صاحبزادوں رضی اللہ عنہما کا خصوصی اکرام کرتے، انہیں خوش آمدید اور مرحبا کہتے، عطایا دیتے، دو لاکھ درہم تک ان کی خدمت میں پیش کرتے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ وفات پا گئے تو حضرت حسین رضی اللہ عنہ ہر سال وفد کے ساتھ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے پاس آتے تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اُن کی خوب خدمت اور عزت کرتے۔ خلافتِ معاویہ رضی اللہ عنہ میں ہونے والے غزوہ قسطنطنیہ میں بھی آپ شریک تھے۔'' (البدایۃ والنہایۃ، ج:۸،ص:۱۶۲)

آپ کی ازواجِ طاہرات علیہن الرحمۃ والرضوان میں لیلیٰ، حباب، حرار اور غزالہ شامل ہیں۔

اولاد درج ذیل ہے: صاحبزادیوں میں سُکَینہ، فاطمہ اور زینب۔ (سیر الصحابہؓ) بیٹوں میں: علی اکبر، علی اصغر، زید، ابراہیم، محمد، حمزہ، ابوبکر، جعفر، عمر، یزید۔ رحمہم اللہ اجمعین (تاریخ الائمہ، ص:۸۳)

آپ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا المناک اور دردناک واقعہ ۱۰ رمحرم الحرام ۶۱ھ بروز جمعہ یزید کے دورِ جور و جفا میں پیش آیا۔

3- حضرت محسن بن علی رضی اللہ عنہما

سیدنا حضرت محسن رضی اللہ عنہ خاتونِ جنت سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا اور خلیفۂ راشد سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے تیسرے صاحبزادے ہیں، آپ صحابیِ رسول، نواسۂ رسول اور باغِ نبوت کے مہکتے پھول ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ یکے بعد دیگرے اپنے تین بیٹوں کا نام ''حرب'' رکھتے رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبدیل فرما کر بالترتیب حسن، حسین اور محسّن نام رکھا اور فرمایا کہ: میں نے ان کے نام حضرت ہارون علیہ السلام

کے صاحبزادوں شبیر، شبر اور مشبر کے ناموں پر رکھے ہیں۔ (المستدرک علی الصحیحین، رقم: ۴۷۷۳، اسدالغابہ، ج: ۱، ص: ۴۹۶) یہ بچپن میں وفات پا گئے تھے۔

4- حضرت علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہما

آپ کا اسم گرامی علی تھا۔ آپ حضرت ابوالعاص لقیط بن ربیع رضی اللہ عنہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی بیٹی سیدہ زینب بنت محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صاحبزادے اور امامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے، قبیلہ بنی غاضرہ کی ایک عورت کا دودھ پیا تھا۔

رضاعت کی مدت پوری ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسے حضرت علی بن ابی العاص رضی اللہ عنہما کو اپنے زیرِ کفالت لے لیا تھا، ان کے باپ ابوالعاص بن ربیع اس وقت مکہ میں مقیم تھے اور اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ ابوالعاص بن ربیع جب غزوۂ بدر میں گرفتار ہوئے تو اس شرط پر رہا ہوئے کہ وہ اپنی بیوی کو مدینہ بھیج دیں گے، چنانچہ انہوں نے رہائی کے بعد زینبؓ بنت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے دونوں بچوں (علیؓ بن ابوالعاص اور امامہؓ بنت ابوالعاص) کو بھی ساتھ بھیج دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسے کی تربیت اور پرورش خود فرمائی۔ (الاستیعاب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے روز شان وشوکت اور جاہ وجلال کے ساتھ مکرمہ میں داخل ہوئے تھے تو اپنے پیچھے اپنی سواری پر علی بن ابوالعاص رضی اللہ عنہما کو سوار کیا تھا، یوں آپؓ کو ردیفِ پیغمبر اور ہم رکابِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہونے کا شرف حاصل ہے۔ (الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب)

علی بن ابوالعاص رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں بلوغت کے قریب پہنچ کر وفات پائی۔ البتہ ابن عساکرؒ نے بعض اہلِ علم کا قول نقل کیا ہے کہ جنگِ یرموک کے موقع پر شہید ہوئے۔

5- حضرت عبداللہ بن عثمان رضی اللہ عنہما

نواسۂ رسول سیدنا حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دوسری صاحبزادی سیدہ رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن مبارک سے خلیفۂ راشد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں۔ انہی کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی کنیت ابوعبداللہ ہے، بچپن میں چھ سال کی عمر میں وفات پا گئے تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسیاں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تین نواسیاں ہیں:

1- سیدہ زینب بنت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہا

یہ حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی صاحبزادی ہیں، ان کا نکاح اپنے چچا زاد حضرت عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہما سے ہوا، یہ اپنے بھائی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے ساتھ میدانِ کربلا میں تھیں، تمام مصائب نہایت صبر و استقلال سے برداشت کیے، ان کے بیٹے حضرت عدی بھی میدانِ کربلا میں شہید ہوئے۔

2- سیدہ اُم کلثوم بنت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما

حضرت فاطمہ اور حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہما کی لختِ جگر ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں پیدا ہوئیں۔

ان کا نکاح حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ہوا، چالیس ہزار درہم حق مہر مقرر ہوا، اسی وجہ سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دامادِ علیؓ کہا جاتا ہے، ان کے بطن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دو بچے ہوئے، زید اکبر اور رقیہ۔

سیدہ اُم کلثوم رضی اللہ عنہا اور ان کے بیٹے زید کا انتقال ایک وقت میں ہوا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ کی امامت کے لیے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو آگے کیا۔

3- سیدہ اُمامہ بنت ابی العاص رضی اللہ عنہا

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی بیٹی سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے بطن سے حضرت ابوالعاص لقیط بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیٹی ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں پیدا ہوئیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے بہت محبت کرتے تھے، ان کو کندھوں پر سوار کر کے نماز ادا فرماتے تھے، جب سجدہ کرتے تو اُتار دیتے، قیام میں پھر اُٹھا لیتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک ہار بطور ہدیہ آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میرے گھر والوں میں جو مجھے سب سے زیادہ محبوب ہوگا، میں اسے یہ ہار دوں گا، ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کا خیال تھا کہ یہ ہار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حصہ میں آئے گا، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لاڈلی نواسی سیدہ اُمامہ رضی اللہ عنہا کو بلا کر اپنے دستِ مبارک سے وہ ہار اُن کے گلے میں ڈال دیا۔ سیدہ امامہؓ کی آنکھ میں کچھ لگا ہوا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ سے اسے صاف کیا۔ نجاشی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خدمت میں چاندی کی انگوٹھی بھیجی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ انگوٹھی سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا کو عطا فرمائی۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد سیدہ فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی وصیت کے مطابق حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان سے نکاح کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد سیدہ امامہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت مغیرہ بن نوفل رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ (الاصابہ، الاستیعاب)

(باقی صفحہ نمبر: ۵۹)

وضعِ حدیث کی ابتداء اور دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم
میں اس کی روک تھام کی کوششیں

مولوی محمد ارشاد بن قیمت بہادر
متخصص فی علوم الحدیث (بنوری ٹاؤن)

تمہید:

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، صحابہ کرام رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین اور کفار مکہ کے درمیان کئی نسبتوں کی حامل تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کفّار مکہ کے درمیان صادق وامین، فیصل وثالث، اور وفاء عہد جیسی کئی اہم نسبتوں سے متّصف ومعروف تھے۔

اسی طرح صحابہ کرام کے درمیان بھی حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی مبارک کئی نسبتوں کی حامل تھی، لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور رسول خدا ہونے کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے استاذ ومعلم بھی تھے، مربّی ومرشد بھی تھے، تمام انسانوں سے زیادہ محبوب تھے، نمونہ حیات اور اسوہ حسنہ بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول وفعل ان کے لیے ان کی زندگی میں جزء ترکیبی کی حیثیت رکھتا تھا، جس کے لیے وہ اپنا سب کچھ قربان کرنے کو تیار رہا کرتے تھے، لہٰذا جب یہ حال تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کو شریعت کا جزء بنالیا جاتا جس کی گواہی خود اللہ تبارک وتعالی نے بھی دی کہ :وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الآیۃ)۔

ترجمہ:"اور رسول تم کو جو کچھ دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس چیز (کے لینے) سے تم کو روک دیں (اور بعموم الفاظ یہی حکم ہے افعال اور احکام میں بھی) تم رک جایا کرو"۔

ایک ادنیٰ انسان بھی اپنی طرف جھوٹی بات کی نسبت کو برداشت نہیں کرسکتا، حضور کی ذات گرامی جو اتنی نسبتوں اور اہمیتوں کی حامل ہیں، یہ کس طرح گوارہ کریں گے کہ ان کی اَن کہی بات کو ناپاک مقاصد کے پیش نظر ان کی طرف منسوب کرکے شریعت کا جزء بنالیا جائے؟!۔ چنانچہ آنے والے زمانے میں اسی خطرے کو محسوس کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:إنّ کذبا عليّ لیس ککذب علی أحد۔(الحدیث)

ترجمہ: ”مجھ پر جھوٹ بولنا (سنگینی کے اعتبار سے) کسی عام شخص پر جھوٹ باندھنے جیسا نہیں ہے“۔

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وعید کے طور پر فرمایا: **من كذب عليّ متعمّدا فليتبوّ أمقعده من النار۔ (الحدیث)**

ترجمہ: ”جس نے مجھ پر افتراء بازی کی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنّم بنالے“۔

ان ارشادات کا مقصد یہ تھا کہ کوئی قبیح النفس آدمی اپنی کہی ہوئی بات کی تشہیر وترویج کے لیے اور اسکو شریعت کا جزء بنانے کی فاسد نیت سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ کرے۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی احتیاط کے پہلوؤں کو اختیار کرتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو حفظِ حدیث کی بھی ترغیب دی، اور ادائیگی حدیث میں الفاظ کی تغیر وتبدیلی سے حفاظت کی بھی ترغیب دی، ارشاد فرمایا: **نضّر الله امرأ سمع مقالتي فوعاها وحفظها وبلغها۔ (الحدیث)**

ترجمہ: ”اللہ تعالیٰ تروتازہ رکھے اس شخص کو جس نے میری بات سنی، پھر اس کی حفاظت کی اور اسے یاد کیا اور پھر اس کو آگے پہنچایا“۔ اور ایک روایت میں ہے کہ: **فبلغه كما سمع** کہ ”بغیر کسی تبدیلی کے اس کو آگے پہنچادیا“۔

خلافتِ راشدہ اور کبار صحابہ کے دور میں نقدِ روایات:

جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوا، اور خلافت راشدہ کا دور شروع ہوا، تو حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی اور بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کثرت سے احادیث کے حافظ ہونے، اور صدق وامانت اور خیر القرون کا زمانہ ہونے کے باوجود روایتِ حدیث میں انتہاء درجہ کی احتیاط رکھتے تھے، جس کی بنیادی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہی ارشادات گرامی تھے جو روایتِ حدیث میں کمالِ احتیاط پر مبنی تھے۔ لہٰذا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس کے پیش نظر نقدِ حدیث کے لیے اور روایت کی جانچ پرکھ کرنے کے لیے مختلف ذاتی معیارات بھی منتخب کیے تھے اور عمومی طور پر بھی معیارات وضع کیے تھے، مثلاً:

روایت کا نصوص قرآنیہ، اور قواعدِ دینیہ سے موازنہ کیا جاتا اور یہ دیکھا جاتا، کہ اگر موافقت ہوتی تو حدیث کو قبول کرلیا جاتا، ورنہ رد کردیتے، جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا سے مروی روایت کو قرآن کے مخالف ہونے کی بناء پر رد کردیا، جب ان کے سامنے فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت آئی، جس میں ذکر ہے کہ ان کے شوہر نے ان کو تین طلاقیں دیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے شوہر پر نہ ہی رہائش کو لازم فرمایا اور نہ ہی نان ونفقہ مقرر فرمایا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

ما كنّا نترك كتاب الله وسنّة نبيّنا صلى الله عليه وسلم، لقول إمرأة، لا ندري لعلها حفظت أم نسيت،

لها السّکنیٰ و النّفقة، قال اللہ تعالیٰ: لَا تُخْرِجُوهُنَّ مِنۢ بُيُوتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ إِلَّآ أَن يَأْتِينَ بِفَٰحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ۔

ترجمہ: "ہم قرآن وسنت نبوی کو کسی عورت کی کہی ہوئی بات کی وجہ سے نہیں چھوڑیں گے جس کے بارے میں یہ علم نہیں کہ وہ اس بات کو یاد رکھ پائی ہے یا بھول چکی ہے، لہٰذا اس کے لیے سکنیٰ ونفقہ ہوگا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ان عورتوں کو ان کے (رہنے کے) گھروں سے مت نکالو، اور نہ وہ عورتیں خود نکلیں مگر ہاں کوئی کھلی بے حیائی کریں۔

اسی طرح حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت عمر کی حدیث: إن المیّت لیعذّب ببکاء أهله (یقینا مردے کو ان کے اہل وعیال کے رونے کی وجہ سے عذاب دیا جائیگا) کو نصِّ قرآن کے مخالف ہونے کی بناء پر رد کیا اور فرمایا: حسبکم القرآن، قال اللہ تعالیٰ: أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ۔ (الآیۃ)

اس طرح احتیاط کے لیے ذاتی طور پر بھی نقدروایت کے لیے کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین نے معیارات وضع کیے تھے، مثلاً: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کی توثیق کے لیے یہ معیار مقرر کیا کہ وہ راوی سے اس کی روایت پر شاہد اور مؤید طلب کیا کرتے تھے، جیسے: جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک بڑھیا کے لیے میراث کا فیصلہ آیا، تو فرمایا: "میں اس کے بارے میں کتاب اللہ میں کوئی حکم نہیں پاتا، اور نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے کوئی فیصلہ پاتا ہوں"۔ پھر لوگوں سے پوچھنے پر حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ صورت میں "سدس" (چھٹا حصہ) عطا فرمایا ہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس وقت ان سے فرمایا: هل معک أحد؟ تو محمد بن مسلمہ نے گواہی دی، تب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فیصلہ صادر فرمایا۔

اسی طرح جب حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ روایت سنائی: إذا استأذن أحدکم ثلاثا فلم یؤذن له فلیرجع (جب تم میں سے کسی ایک نے تین مرتبہ اجازت طلب کی اور اس کو نہ مل سکی، تو اس کو چاہیے کہ وہ لوٹ جائے) تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر گواہ طلب کیا، پھر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر ان کے حق میں گواہی دی، تب انہوں نے روایت کو قبول فرمایا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ معیار مقرر فرمایا تھا کہ وہ راوی سے اس کے سماع پر قسم لیا کرتے تھے کہ اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت سنی ہے، خطیب بغدادی نے ذکر کیا ہے: عن علي بن أبي طالب قال: کنت إذا سمعت من النبي صلی اللہ علیه و سلم حدیثا نفعني اللہ بما شاء منه، و إذا حدثني غیري عن النبي صلی اللہ علیه و سلم لم أرض حتی یحلف لي أنه سمعه من النبي صلی اللہ علیه و سلم۔۔

ترجمہ: ”حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب میں (براہ راست) حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حدیث سنا کرتا، تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق مستفید ہوتا، اور جب کوئی اور مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سناتا تو میں اس وقت تک اس پر راضی نہیں ہوتا جب تک وہ قسم نہ کھالیتا کہ اس نے یہ حدیث حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔“

بہر حال اس دور میں ذخیرہ حدیث اور شریعت کی اس اساس کی مختلف طریقوں سے حفاظت کی گئی، کسی نے کتابتِ حدیث سے، کسی نے کثرتِ روایت سے، اور کسی نے قلّتِ حدیث میں حفاظت کا پہلو جان کر اپنا حصہ ڈال دیا۔

وضع حدیث کے ابتدائی مراحل:

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ آخر میں جو قرن اول کے دوسرے ثلث کا ابتدائی زمانہ تھا ان کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا، اور امت مسلمہ میں مختلف فرق ضالّہ کا وجود اور ظہور ہونا شروع ہوا، اور ہر ایک اپنی آراء وافکار کی تائید و دفاع کی آڑ میں اپنی رائے کو ہی دین سمجھ کر حضور اکرم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت کرنے لگا، جس کی وجہ سے ذخیرہ حدیث اور شریعت کی اس اساس و بنیاد پر وضعِ حدیث کی اصطلاح کی صورت میں ایک نیا فتنہ ابھر کر سامنے آیا، اور ”مختار ثقفی“ جیسے زنادقہ کے کوفہ اور دوسرے شہروں میں ظہور سے اس میں خاصی شدت آئی، جس نے امت مسلمہ کے لیے پُرخطر صورت اختیار کی، پھر بعد کی صدیوں میں اس فتنے نے کبھی آہستگی اور کبھی سرعت رفتاری کے ساتھ بدعت اور فتن کے بڑھنے کے باعث کثرتِ موضوعات کی صورت اختیار کی، یہاں تک کہ ایک ایک راوی حدیث کے نام پر کئی کئی مجموعے حضور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے وضع کر لیا کرتا تھا، خلیفہ محمد مہدی کہتے ہیں:

أقر عندي رجل من الزنادقة أنه وضع أربع مائة حديث فهي تجول في أيدي الناس ۔

ترجمہ: ” میرے پاس زنادقہ میں سے ایک شخص نے چار سو احادیث کے وضع کرنے کا اعتراف کیا، جبکہ وہ احادیث لوگوں کے درمیان گردش کر رہی ہیں“۔

دوسرا واقعہ حماد بن زید رضی اللہ عنہ کا ہے، ان کا بیان ہے کہ:

وضعت الزنادقة على رسول الله صلى الله عليه و سلم أربعة عشر ألف حديث ۔

ترجمہ: ”زنادقہ نے حضور کی طرف تقریباً چودہ ہزار احادیث منسوب کر کے وضع کیں“۔

اور اس نوعیت کے مختلف اسباب کے تحت احادیث کو گھڑ لیا جاتا تھا، زمانے کے آگے بڑھنے اور بدلنے کے

ساتھ یہ اسباب مختلف ہوتے گئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے زمانہ میں زنادقہ کا مقصد، دین میں تخریب کاری تھا، اسی طرح ہر فرقہ کے وضعِ حدیث کا مقصد، احادیث کے ذریعہ سے اپنے افکار کی تائید اور ترویج وتشہیر ہوا کرتی تھی، اور پھر بعد کی صدیوں میں بھی کبھی ترغیب وترہیب اور کبھی دنیا کی لالچ ملحوظِ نظر ہوا کرتی۔

وضع حدیث کے ابتداءِ زمانہ میں اختلاف:

بہر کیف اس بات کا یقینی علم تو مؤرخین کو نہیں ہوسکا کہ متعین واقعہ کی طرف اور کس متعین شخصیت کی طرف وضع حدیث کی ابتداء کی نسبت ہوئی ہے؟ اس بنا پر آج بھی اس بارے میں مختلف آراء ہیں، تفصیل حسب ذیل ہے:

پہلا قول:

وضع حدیث اور کذب علی الرسول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتداء کو حضور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد: **من كذب علي متعمدا فليتبوأ مقعده من النار** (الحدیث) کے شانِ ورود کی طرف منسوب ہے، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی وضع حدیث کے کسی واقعہ کے پیش آنے کے وقت آپ نے ارشاد فرمایا ہوگا، جیسے امام ابن الجوزی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ''الموضوعات'' (ص 1/55) میں مختلف طرق سے اس سے متعلق ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ ایک آدمی مدینہ منورہ کے اطراف میں ایک قوم کے پاس آکر کہنے لگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے تمہارے بارے میں اور تمہارے اموال کے بارے میں اپنی رائے سے فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے، اور اس نے زمانۂ جاہلیت میں ایک عورت کو نکاح کا پیغام بھیجا تھا جس کو اس کے گھر والوں نے مسترد کردیا تھا، پھر اس نے جاکر اس عورت کے ہاں پڑاؤ ڈالا، لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس کے متعلق پیغام بھیجا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے دشمن نے جھوٹ کہا ہے، اور پھر ایک صحابی کو یہ فرما کر بھیجا کہ اگر اس کو زندہ پاؤ تو قتل کردو، اور اگر مردہ پاؤ تو جلا دینا، وہ صحابی گئے تو اس کو مرا ہوا پا کر آگ میں جلا دیا۔ اس موقعہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ بولا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم بنادے''۔

دوسرا قول:

وضع حدیث کی ابتداء ''مختار ثقفی'' کے کوفہ میں ظہور سے ہوئی اور یہی پہلی شخصیت ہے جس نے لوگوں کو اور بعض نام نہاد محدثین کو وضع حدیث جیسے رکیک عمل پر آمادہ کیا، یہ قرن اول کے ثلث آخیر کا زمانہ تھا، اس قول کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے جسے علامہ ابن الجوزی نے ''الموضوعات'' میں اپنی سند کے ساتھ ذکر کیا ہے:

بأن قال المختار لرجل من أصحاب الحديث: ضع لي حديثا عن النبي صلي الله عليه وسلم، إني كائن

بعده خليفة و طالب له۔

ترجمہ: "مختار ثقفی نے ایک شخص سے یہ حدیث وضع کرنے کا کہا کہ میں حضور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ ہوں، (اور آگے ہے کہ) اس کے بدلے یہ دس ہزار درہم اور سامان، سواری، اور خادم ہے۔اس آدمی نے کہا کہ حضور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف یہ بات منسوب نہیں کرسکتا، البتہ کسی بھی صحابی کی طرف منسوب کر کے اس کا قول وضع کرلوں گا، اور اس کا معاوضہ کم دے دو، مختار ثقفی نے کہا: عن النبي صلي الله عليه و سلم أو كد، اس شخص نے کہا: و العذاب أشدّ، یعنی اگر حضور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے میں زیادہ تاکید ہے تو عذاب بھی اتنا ہی سخت ہے۔

بہرحال اس شخص نے اگرچہ قبول تو نہیں کیا، لیکن کم از کم اس بات کا علم ضرور ہو جاتا ہے کہ یہ مختار ثقفی اس سلسلے کا محرِّک تھا، اور اسی کے درپے ہوا کرتا تھا، اور اس سے نہیں تو کسی اور آدمی سے ضرور حدیثیں وضع کی ہوں گی، لہٰذا اس کی طرف وضع حدیث کی ابتداء کو منسوب کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا قول:

وضع حدیث کی ابتداء حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قتل کے المناک واقعہ پیش آنے کے بعد سے ہوئی؛ کیونکہ اس کے بعد خوارج و روافض جیسے فرق ضالہ کا ظہور ہوا، جو کذب و افتراء علی الرسول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سبب بنا ہے۔

اور اس قول کی تائید حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، اور ابن سیرین رحمہ اللہ کی روایات سے بھی ہوتی ہے، ابن سیرین رحمہ اللہ کی روایت ہے:

لم يكونوا يسألون عن الإسناد، فلما وقعت الفتنة، قالوا: سموا لنا رجالكم، فينظر إلى أهل السنة فيؤخذ حديثهم، وينظر إلى أهل البدع فلا يؤخذ حديثهم۔

ترجمہ: "صحابہ رضی اللہ عنھم سند کے حوالے سے سوال نہیں کیا کرتے تھے، البتہ جب فتنوں کا ظہور ہوا تو پھر وہ کہنے لگے: ہمیں اپنی روایات کے رجال کی شناخت کراؤ، تاکہ جو اہل سنت میں سے ہو تو اس کی روایت کو قبول کرلیا جائے اور بدعتی کی روایت کو نہ لیا جائے"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے:

إنّا كنّا نحدّث عن رسول الله صلى الله عليه و سلم إذا لم يكن يكذّب عليه، فلما ركب الناس الصّعب و الذّلول تركنا الحديث عنه۔

ترجمہ: "ہم حضور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت حدیثیں بیان کیا کرتے تھے، لیکن جب لوگ ہر قسم کی سواریوں پر سوار ہونے لگے (یعنی ہر رطب و یابس نقل کرنے لگے) تو ہم نے (احتیاطا) حدیث بیان کرنا چھوڑ دیا"۔

مذکورہ روایات کے پیش نظر یہ راجح معلوم ہوتا ہے کہ وضع حدیث کی ابتداء اگرچہ کم اور غیر منظم ہی سہی، لیکن قتل عثمان رضی اللہ عنہ کے نتیجے میں پیش آنے والے فتن اور فرق ضالہ کا ظہور ہوا جس سے زنادقہ کو دین میں تخریب کاری کرنے کا بہترین موقع میسر ہوا، جیسے ابن سیرین کی روایات میں صراحت ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ اگلے دور میں ابن سبا اور مختار ثقفی لعنۃ اللہ علیہما اور دوسرے زنادقہ کے دور میں اس کی ترویج وتشہیر ہوئی۔ اور یہی وجہ تھی کہ یہ سمندر یہاں تھما نہیں، بلکہ جب جب علماء کا فقدان ہوتا گیا، علمی مجالس کی رونقیں مدہم ہوئیں، اور اس کے نتیجے میں شریعت کے احکام کے لیے غیر معتبر مراجع کی طرف رجوع ہوا، اور ہر طرح کے کھرے کھوٹے کو لیا جانے لگا، جس کا نقشہ حضور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھینچا ہے:

ان اللہ لا یقبض العلم إنتزاعا ینتزعہ من الناس، ولکن یقبض العلم بقبض العلماء، حتی إذا لم یبق عالما اتخذ الناس رؤوسا جھالا، فسئلوا فأفتوا بغیر علم، فضلوا و أضلوا۔

ترجمہ: "اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں (کے سینوں) سے اچک کر ختم نہیں کریں گے، بلکہ علم کو علماء کے مفقود کرنے سے ختم کرلیں گے، اور جب کوئی عالم نہیں رہے گا تو لوگ جاہل سرداروں پر لپک پڑیں گے، جب ان سے سوال کیا جائے گا اور وہ جہالت پر مبنی فتویٰ دیں گے تو خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے"۔

بہرحال اسی صورت حال کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان ضعیف جھوٹی اور من گھڑت احادیث کی ترویج ہوئی، جس سے انسانیت کے اہم ترین انقلابی عہد کا معتبر ترین ذخیرہ داغدار ہونے کے قریب ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ بذات خود اس وحی شریعت کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے، جس کا ذکر قرآن کریم میں فرمایا ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۔ الآیۃ۔

ترجمہ: "ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ (اور نگہبان) ہیں"۔

لہٰذا ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے ایسے رجال کار اس امت کو عطاء فرمائے جنہوں نے اپنی زندگیاں وقف کر کے اور احادیث کی خدمت کرتے ہوئے ہر صحیح وسقیم، کھرے کھوٹے میں فرق کر کے ایک طرف مفسدینِ دین اور زنادقہ کے ہر پتھر کا بدلہ چٹان سے دیا، وہیں دوسری طرف امت مرحومہ کی بہت بڑی گمراہی سے حفاظت کی، جیسے علامہ خطیب بغدادی (رحمہ اللہ تعالی) نے "الکفایۃ فی علم الروایۃ" میں عبداللہ بن المبارک رحمہ اللہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ: **قیل لابن المبارک: ھذہ الأحادیث المصنوعۃ؟ قال: یعیش لھا الجھابذۃ۔**

ترجمہ:" جب ابن مبارک سے موضوع ومصنوع احادیث کے بارے میں پوچھا گیا،توفرمایا: اس کے لیےتو کھرےکھوٹے کو پرکھنے کے ماہرین زندہ ہیں"۔

اسی طرح حضورصلی اللہ علیہ وسلم کاارشاد ہے:

يحمل هذاالعلم من كل خلف عدوله،ينفون عنه تحريف الغالين،وانتحال المبطلين،وتأويل الجاهلين۔

ترجمہ: "اس علم کواگلی نسل کےایسے انصاف پسند اہل علم اٹھائیں گے، جوغلوکرنے والوں کی تحریفات، اہلِ باطل کےغلط انتسابات اورجاہلوں کی غلط تاویلات کی بیخ کنی کریں گے"۔

اور پھرگزرتے وقت کےساتھ ساتھ وضع حدیث میں شدت کے بالمقابل محدثین اوران رجال کارائمہ کرام نے بھی اپنےصحابہ کرام کے دور سے ہی حصول علم اورروایتِ حدیث میں احتیاط کے لیےرحلات کرنے کا سلسلہ شروع ہوا،جس کی بناء پر وضاعین کی گرفت کی جاتی تھی، بعد کے زمانہ میں خاص احادیث موضوعہ کوبھی تالیف وتصنیف کرکے باقاعدہ جمع کیا گیا،جس کی بناء پر بہت ساراذخیرۂ موضوعات امت کےسامنےپیش کیا گیا،جیسے"الموضوعات لابن الجوزی""تذكرة الموضوعات لأبي الفضل محمد بن طاہرالمقدسی""کتاب الموضوعات من الاحادیث المرفوعات لابی عبداللہ الجوزقی""اللآلى المصنوعة في الأحاديث الموضوعة للسيوطي"، اوران کےعلاوہ بہت ساری کتابیں ہیں جن میں ذخیرۂ موضوعات کوصحیح احادیث سے الگ کرکے یکجا جمع کیا گیا۔

خاتمہ بحث:

محدثین کی انہی خدمات کے ذریعہ اللہ تعالی نے اس عظیم ذخیرہ اوروحیٔ شریعت کی حفاظت فرمائی،لہذا یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ ذخیرۂ حدیث جس طرح وضع حدیث سے پہلے قابل اعتماد تھا،آج بھی اللہ تعالیٰ نےصحابۂ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین اورمحدثین کی خدمات کی بناء پراسی طرح قابل اعتماد ہے،اورتخریب کاروں اورمفلوج ذہنوں سے متاثر ہونے کی وجہ سے اس میں کسی قسم کی کوئی شک وشبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہی۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ ذخیرۂ حدیث کی حفاظت کی خاطر معتبر احادیث کی اشاعت اورموضوع روایات کی روک تھام میں اپنی وسعت کےمطابق کرداراداکریں،اللہ تعالیٰ ہماری صلاحیتوں کواس کارخیر کے لیےقبول فرمائیں۔آمین!

اللہ ہم سب کاحامی وناصرہو۔آمین! واللہ تعالی اعلم بالصواب۔

مقالات ومضامین

شَنقیطی محاظر اور برصغیر کے دینی مدارس: تقابل اور اہم تجاویز

بقلم: ڈاکٹر عامر بہجت حفظہ اللہ
مدرّس: جامعہ طیبہ، مدینہ منورہ
ترجمہ: مفتی شاد محمد شاد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ وصلی اللہ وسلم علی رسول اللہ، أمّا بعد:

مجھے دینی مدارس کی زیارت اور وہاں کے علومِ شرعیہ کی تدریس کے طریقوں کو سمجھنے کا شوق رہا ہے۔ اللہ نے مجھے سعودی جامعات میں فقہ کی تدریس کے نظام کا مطالعہ کرنے کی توفیق دی، اور جب بھی میں کسی ایسے شخص سے ملتا جو کسی دینی تعلیمی ادارے سے وابستہ ہوتا، تو میں اس سے وہاں کے نصاب اور تدریسی طریقہ کار کے بارے میں پوچھتا۔

سال 1438ھ میں اللہ تعالی نے مجھے ہندوستان کے سفر کی توفیق دی، جہاں میں نے کئی اسلامی مدارس اور جامعات کا دورہ کیا، جن میں دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، ندوۃ العلماء، فلاح الدارین (ترکیسر)، اور اشاعۃ العلوم (اکل کوا) وغیرہ شامل ہیں۔ میں نے برصغیر کے کئی جید علما اور ان مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ سے ملاقات کی۔ پھر میں نے 1439ھ میں دوبارہ وہاں کا سفر کیا، اور تیسری بار 1440ھ میں وہاں گیا۔

اس کے علاوہ مدینہ منورہ میں رہائش کے سبب اللہ نے مجھے برصغیر کے علما اور جامعہ اسلامیہ (مدینہ یونیورسٹی) کے ان طلبہ سے ملاقات کے مواقع بھی عطا کیے جو وہاں کے مدارس سے فارغ التحصیل تھے۔

1440ھ میں اللہ نے مجھے موریتانیہ (شنقیط) جانے کی بھی توفیق دی، جہاں میں نے ان کے مدارس، جو ''محاظر'' کہلاتے ہیں، میں تعلیمی طریقے کا مشاہدہ کیا۔ میں نے **محظرۃ أم القری، محظرۃ النباغیہ، محظرۃ التیسیر، محظرۃ عین الخشبہ** اور دیگر کئی محاظر کا دورہ کیا، نیز وہاں کے علما سے بھی ملاقات کی۔

میرا ذہن خود بخود ہندوستان اور موریتانیہ کے تعلیمی نظام کا تقابل کرنے لگا تاکہ میں ہر ایک سے بہترین پہلو تلاش کرسکوں۔

اس تقابل میں جانے سے پہلے، میں ایک نکتے کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا کہ موریتانیہ کی کل آبادی محض ساڑھے چار ملین سے بھی کم ہے، جبکہ میرے خیال میں ہندوستان میں صرف دینی مدارس کے طلبہ اور فارغ التحصیل افراد کی تعداد ہی اس سے زیادہ ہوگی۔

یہی سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک سوال آیا کہ دونوں جگہوں پر علما اور علم میں پختگی رکھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟ میں اس سوال کا جواب دیے بغیر آگے بڑھتا ہوں، مگر ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔

میں نے ہندوستان سے فارغ التحصیل ایک نوجوان مفتی سے پوچھا: ''آپ نے فقہ میں کیا کچھ پڑھا؟''

اس نے جواب دیا: (نور الایضاح، القدوری، شرح الوقایۃ، الہدایہ) اور شاید یہ بھی کہا: (کنز الدقائق)۔

میں نے اس سے فقہ حنفی کے چند مشہور مسائل پر بات کی، تو میں نے پایا کہ وہ بالکل ہی خالی ہاتھ تھا! بلکہ حیرت کی بات یہ ہوئی کہ ایک سال بعد اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اسے فقہ حنفی پڑھاؤں، حالانکہ میں خود حنبلی ہوں اور فقہ حنفی میں صرف ''القدوری'' اور ''الوقایۃ'' کے عبادات کے باب تک ہی محدود مطالعہ رکھتا ہوں!

دوسری طرف، میں نے موریتانیہ کے ایک مدرسے کے ایک نوعمر طالب علم سے جب کہا کہ مجھے متن الآجرومیۃ (جو عرب دنیا میں مشہور نحو کی کتاب ہے) سے کچھ حصے کی شرح سنادو۔

یہ نوجوان بلا جھجک زبانی متن سنانے لگا، اس کی عبارتوں کی وضاحت کرنے لگا، اور مثالیں بھی دینے لگا۔ میں نے مختلف مقامات سے اس کا امتحان لیا، تو میں نے اسے انتہائی پختہ پایا، گویا وہ کسی کتاب کے بغیر بھی درس دینے کے قابل تھا!۔ یہ دیکھ کر میں نے خود سے سوال کیا کہ یہ فرق کیوں ہے؟ اور مجھے اس کا جواب صاف نظر آیا: یہ فرق ''حفظ، ضبط، تکرار اور اور توجہ'' کا ہے۔

پہلا نکتہ: حفظ (یاد کرنا)

علماءِ شریعت اس بات پر متفق ہیں کہ حصولِ علم کے لیے حفظ ضروری ہے۔ بلکہ یہ بات قرآن وسنت میں بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں فرمایا:

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ

(حقیقت تو یہ ہے کہ یہ قرآن ایسی نشانیوں کا مجموعہ ہے جو ان لوگوں کے سینوں میں بالکل واضح ہیں جنہیں علم عطا کیا گیا ہے) [العنکبوت:49]

اسی طرح حدیث میں آیا ہے:

احفظوه وأخبروه من وراءكم

''اسے حفظ کرو اور ان لوگوں کو بتاؤ جو تمہارے بعد آئیں گے۔''

علماء کے اقوال بھی حفظ کی اہمیت پر بے شمار ہیں۔مثلاً امام ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''میں نے فقہ کے طالب علموں پر غور کیا تو پایا کہ وہ درس کو دو یا تین بار دہراتے ہیں، مگر دو دن گزرنے کے بعد وہ اسے بھول جاتے ہیں، اور اگر کسی مسئلے میں مناظرے کے دوران ان کو اس علم کی ضرورت پڑے تو وہ اسے بیان نہیں کر پاتے، نتیجتاً ان کا ابتدائی وقت ضائع ہو جاتا ہے!۔''

ابن الجوزی مزید کہتے ہیں: ''علم وہی ہے جو حفظ (یاد) کیا جائے۔''

اسی طرح علامہ الحکمي نے اپنی منظوم تصنیف میں تحصیلِ علم کے اصول بیان کرتے ہوئے کہا:

والحفظ أولى ما مضى من أسس		فادأبْ عليه في الضحى والغلسِ
والحفظ أولاها بالاهتمامِ		وهو طريق السلف الأعلامِ
لاتصغ يا أُخَيَّ للإرجافِ		ولتتّبِعْ مناهج الأسلافِ

''حفظ ہی سب سے پہلی بنیاد ہے، پس صبح وشام اس پر محنت کرو حفظ ہی سب سے زیادہ توجہ کا مستحق ہے، اور یہی سلف صالحین کا طریقہ رہا ہے اے میرے بھائی! کم ہمتی کی باتوں پر کان نہ دھرو، بلکہ سلف کے طریقوں کی پیروی کرو۔''

اسی طرح امام صیر في کے قول کو امام خطیب بغدادي نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے:

لیس بعلمٍ ما حوی القمطْرُ　　ما العلمُ إلا ما حواه الصدرُ

''علم وہ نہیں جو کاغذوں میں بند ہو، بلکہ علم وہ ہے جو سینے میں محفوظ ہو۔''

اور ابن ابي الحدید نے اپنی مشہور منظومہ ''الفصیح'' کے آغاز میں کہا:

فالعلم إذا لم ينضبطْ بالحفظِ　　لم ينفعْ و من مارى غلِطْ

''علم اگر حفظ کے ذریعے مضبوط نہ ہو تو فائدہ نہیں دیتا، اور جو اس سے اختلاف کرے وہ غلطی پر ہے۔''

اکثر طلبہ امام رحبی کا مشہور قول یاد رکھتے ہیں:

فاحفظ فكل حافظٍ إمامُ

(حفظ کرو، کیونکہ ہر حافظ (یاد کرنے والا) امام ہوتا ہے!)

اگر میں اہلِ علم کے اس اتفاق کو بیان کرنے لگوں کہ طالب علم کے لیے حفظ ضروری ہے، تو یہ مضمون طویل ہو جائے گا۔لیکن کہا جاتا ہے کہ (حسبنا من القلادة ما أحاط بالعنق) ''ہار کا وہی حصہ کافی ہوتا ہے جو گردن کے گرد آ

جائے۔'' شاید میں بعد میں حفظ کی اہمیت پر الگ مضمون تحریر کروں گا، ان شاء اللہ۔

اب میں اس تقابل کی طرف واپس آتا ہوں جو میں نے مضمون کے آغاز میں ذکر کیا تھا۔

موریتانیہ کے محاظر (مدارس) میں کوئی بھی طالب علم کسی بھی کتاب کو بغیر حفظ کیے نہیں پڑھ سکتا، خاص طور پر بنیادی متون۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں سے فارغ التحصیل طالب علم جو کچھ پڑھتے ہیں، اسے مکمل یا کم از کم بڑی حد تک یاد رکھتے ہیں۔ جبکہ برصغیر کے اسلامی مدارس میں قرآن کے علاوہ کوئی بھی کتاب حفظ کرنے کا رجحان نہیں ہے۔

حتیٰ کہ میں نے ایک ہندوستانی عالم (رحمہ اللہ) کو تعجب سے یہ کہتے سنا: ''عربوں کے ہاں ایک چیز ہوتی ہے جسے وہ متونِ علمیہ کہتے ہیں، اور اسے حفظ کرتے ہیں!!!''

یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے مدارس سے ہر سال ہزاروں طلبہ فارغ التحصیل ہوتے ہیں، مگر ان میں سے اکثر کے علوم چند ہی سالوں میں ضائع ہو جاتے ہیں، بلکہ بعض کا علم تو فارغ التحصیل ہونے سے پہلے ہی زائل ہو چکا ہوتا ہے!

دوسرا نکتہ: اکثار یا تکرار پر توجہ دینا:

شنقیط (موریتانیہ) کے علماء ایک نظم کو علمی تحصیل کے اصولوں میں شمار کرتے ہیں، جس میں کہا گیا ہے:

وإن تردْ تحصيل فنٍّ تممه وعن سواه قبل الانتهاء مه

وفي ترادف العلوم المنعُ جا إن توأمان اجتمعا لن يخرجا

(اگر کسی فن کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اسے مکمل کرو، اور کسی اور فن کی طرف متوجہ نہ ہو جب تک کہ یہ مکمل نہ ہو جائے۔ علوم کو بیک وقت جمع کرنا منع کیا گیا ہے، کیونکہ اگر دو جڑواں (علوم) اکٹھے ہو جائیں تو دونوں باہر نہیں نکل سکیں گے۔)

موریتانیہ کے محاظر (مدارس) میں طالب علم کسی ایک فن میں کسی ایک متن کو لیتا ہے اور دن رات اسی کو حفظ، فہم، شرح اور تکرار کے ذریعے مکمل کرتا ہے۔ جبکہ ہندوستان کے اسلامی مدارس میں طلبہ بیک وقت دس علوم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی بارے میں امام محمد بن شہاب الزہری نے کہا:

''علم کو ایک ساتھ حاصل نہ کرو، کیونکہ جو علم کو ایک ساتھ حاصل کرنا چاہے گا، وہ اسے ایک ساتھ ہی کھو دے گا، بلکہ علم کو آہستہ آہستہ، دنوں اور راتوں میں حاصل کرو۔''

اسی طرح روایت میں ہے کہ ''جو علم کو ایک ساتھ حاصل کرنا چاہے، وہ سارا علم گنوا بیٹھے گا، بلکہ علم کو ایک ایک حدیث کر کے حاصل کرو۔''

یہی بات ایک اور قول میں کہی گئی ہے: ''علم کا ذہن میں ازدحام، فہم کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔''

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا، برصغیر میں نور الایضاح، قدوری، کنز الدقائق، شرح الوقایہ اور ہدایہ پڑھنے والے

ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہیں۔ لیکن ایک تکلیف دہ سوال یہ ہے کہ:

"کتنے لوگ ہیں جو ان میں سے کسی ایک کتاب کو مکمل طور پر یاد رکھتے ہوں اور اس کی تمام مسائل یا عبارتوں کو حفظ کیے ہوں؟"

اور اگر کوئی کہے کہ: "ایسے مصروف نصاب میں کوئی کیسے حفظ کرے؟" تو یہ بجا اعتراض ہوگا۔

تیسرا نکتہ: غیر عربی زبان میں تدریس

یہ بات سب پر واضح ہے کہ قرآن عربی میں ہے، حدیث عربی میں ہے، اور تقریباً تمام بنیادی اسلامی علوم کی مستند کتابیں بھی عربی میں ہیں۔ یہاں تک کہ امام الشاطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اگر ہم کسی کو عربی زبان کا مبتدی فرض کریں تو وہ شریعت کے فہم میں بھی مبتدی ہوگا... اور جب وہ عربی میں مہارت حاصل کر لے گا تو وہ شریعت میں بھی ماہر ہو جائے گا۔"

یہ بات اپنی جگہ ٹھیک ہے کہ لوگوں کو ان کی زبان میں دین سکھانا ضروری ہے، بلکہ واجب ہے، لیکن عوام کو تعلیم دینا اور علماء کی تربیت کرنا دو الگ چیزیں ہیں۔

اس لیے عام مسلمانوں کو مقامی زبان میں دین سکھانا درست اور ضروری ہے، مگر علماء کی تعمیر و تاسیس غیر عربی میں رکھنا نقصان دہ ہے۔ عربی میں مہارت محض ترجمہ سے نہیں آتی، بلکہ مسلسل مشق اور طویل ممارست سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اردو زبان میں نحو (عربی گرامر) پڑھائی جاتی ہے تو وہ ترجمے کا ایک درس بن کر رہ جاتی ہے۔ میں نے بعض بڑے مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ اور بعض فتویٰ دینے والے علماء سے ملاقات کی، لیکن وہ عربی میں بات نہیں کر سکتے تھے! تو ایسے میں ان سے کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اسلامی علوم میں گہرائی کے ساتھ تحقیق کریں گے؟ اگر کسی نے اس صورتحال میں مہارت حاصل کر بھی لی تو یہ ایک استثناء ہوگا، اور اصول و ضوابط استثناء پر نہیں بنتے۔

آمدم برسر مطلب! اللہ تعالیٰ نے برصغیر میں دین کے تحفظ کے لیے اسلامی مدارس کو ایک عظیم سبب بنایا۔ ان مدارس کی برکتیں اور ان کے اثرات دنیا بھر میں نمایاں ہیں۔ یہ مدارس احادیث کی بنیادی کتب کی تعلیم، اور اسلامی ماحول کی فراہمی جیسے نمایاں اوصاف رکھتے ہیں، جو قابلِ قدر ہیں۔ لیکن اب ان میں اصلاح اور بہتری ضروری ہے، اور یہ سلف صالحین اور اہلِ علم کے طے کردہ اصولوں پر ہونی چاہیے، نہ کہ ذاتی ذوق و آراء پر۔

علماء نے علمی تحصیل کے تین بنیادی اصول طے کیے ہیں:

1- حفظ (یاد کرنا) ضروری ہے۔

2- تکرار اور دہرائی (Repetition) لازمی ہے، اور بہت زیادہ علوم ایک ساتھ نہیں پڑھنے چاہئیں۔

3- دینی تعلیم کے تمام مراحل میں عربی زبان کے ذریعے تعلیم دی جائے۔

تجاویز! اس بنیاد پر، میں برصغیر کے علمائے کرام کے سامنے یہ تجاویز رکھنا چاہتا ہوں:

1- نصاب میں موجود کتابوں کی تعداد کم کی جائے اور زیادہ وقت کو تکرار و مراجعہ میں لگایا جائے۔

مثلاً پانچ فقہی کتابوں (نور الایضاح، القدوري، کنز الدقائق، شرح الوقایۃ، الہدایۃ) کو پڑھانے کے بجائے صرف القدوری یا شرح الوقایہ کو منتخب کیا جائے اور اس کے حفظ کو لازمی قرار دیا جائے۔

2- متون (بنیادی درسی کتب) کے حفظ کو لازمی قرار دیا جائے۔

طالب علم جب تک متون کو مخصوص تعداد میں دہرا کر سنانے کے قابل نہ ہو، وہ فارغ التحصیل نہ ہو۔

مثلاً کسی متن کو پچاس بار سنانے کی شرط رکھی جائے۔

3- تمام دروس عربی میں پڑھائے جائیں، مگر اس سے پہلے طلبہ کو عربی سکھانے کا ایک مؤثر نظام بنایا جائے۔

طلبہ کو علومِ شریعت کی تفصیلی تعلیم سے پہلے عربی میں مہارت دلائی جائے۔

خاتمہ! اگر مدارس سے ایسے طلبہ فارغ ہوں جو کم مگر مضبوط نصاب کے ساتھ، حفظ شدہ اور بار بار دہرائے ہوئے متون اور عربی زبان میں مکمل مہارت کے حامل ہوں، تو یہ علمِ دین کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔

میں برصغیر کے مشائخ کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ موریتانیہ کے "شنقیط" کے مدارس کا دورہ کریں اور ان کے طریقہ تعلیم سے فائدہ اٹھائیں، تاکہ وہ اپنے مدارس میں ایسی اصلاحات کر سکیں جو ان کے حالات کے مطابق ہوں۔

یہ مختصر گزارشات تھیں، ورنہ یہ موضوع مزید تفصیل کا متقاضی ہے۔

وصلی اللہ وسلم علی سیدنا ونبینا محمد وعلی آلہ وصحبہ أجمعین۔

کم عمری کی شادی کے خلاف قانون کا ایک جائزہ

محمد احمد حافظ

ایک خبر کے مطابق ویمن چائلڈ پروٹیکشن اور سول لائن پولیس نے کراچی کی ہجرت کالونی میں مشترکہ کارروائی کرتے ہوئے ایک کم عمر لڑکی کی شادی کروانے کے الزام میں لڑکی کے چچا اور دولہے کو گرفتار کر کے مقدمہ درج کرلیا۔ ترجمان ایس ایس پی ڈسٹرکٹ ساؤتھ کی جانب سے جاری اعلامیے کے مطابق ہجرت کالونی میں ۱۳ ر سالہ کم عمر بچی کی شادی کروائی جارہی تھی جسے ویمن چائلڈ پروٹیکشن سیل اور ساؤتھ پولیس کی بروقت کارروائی کے باعث ناکام بنادی گئی۔ (روزنامہ امت۔ ۱۵ ر جون ۲۰۲۵)

قانون پر اس قدر تیز رفتار عمل درآمد کی یہ ایک نادر مثال ہے، کیونکہ اٹھارہ سال سے کم عمر بچی کی شادی کے خلاف قانون پر صدر پاکستان کے دستخط کی سیاہی بھی ابھی خشک نہیں ہوئی ہے۔

طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ قانون فی الحال صرف وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں لاگو ہوا ہے، لیکن سندھ پولیس کی چابک دستی دیکھیے کہ اس نے اسلام آباد کی حدود سے سینکڑوں کلومیٹر دور کراچی میں بھی اس قانون پر عمل درآمد کرانا ضروری جانا۔

کم عمری کی شادی کے خلاف قانون کیا ہے؟

پاکستان میں کم عمری کی شادی کو روکنے کے لیے قانون سازی کی گئی ہے، جس کے تحت وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں ۱۸ ر سال سے کم عمر لڑکے یا لڑکی کی شادی جرم ہے۔ اس قانون کے تحت کم عمری کی شادی کرنے اور کرانے پر سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔

تفصیلات:

قانون کا اطلاق: یہ قانون وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں نافذ العمل ہے، اور اس کا مقصد بچوں کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے۔

سزائیں: ۱۸/سال سے کم عمرلڑکے یا لڑکی سے شادی کرنے والے مرد کوسزا دی جائے گی، جس میں کم از کم دو سال اورزیادہ سے زیادہ تین سال قید بامشقت اور جرمانہ شامل ہے۔

نکاح رجسٹرار کم عمر بچوں کی شادی کا اندراج نہیں کر سکتے، اور نکاح پڑھانے یا رجسٹر کرنے سے پہلے دونوں فریقین کے شناختی کارڈز کی موجودگی یقینی بنانا ہوگی۔

کم عمر بچوں کی شادی کو نابالغ سے زیادتی تصور کیا جائے گا، اور نابالغ کو شادی کی ترغیب دینے اور زبردستی کرنے والے کو بھی زیادتی کا مرتکب سمجھا جائے گا۔

کم عمری کی شادی پر والدین کو بھی سزا دی جاسکتی ہے، جن میں تین سال قید اور جرمانہ شامل ہیں۔

عدالت کا کردار: عدالت کو کم عمر بچوں کی شادی سے متعلق مقدمات ۹۰ روز میں نمٹانے کا پابند کیا گیا ہے اور عدالت کو حکم امتناع دینے کا بھی اختیار حاصل ہے۔

اہم نکات: یہ قانون بچوں کے حقوق کے تحفظ اور کم عمری کی شادیوں کے نقصانات کو کم کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس قانون کی خلاف ورزی پر سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں، جن میں قید اور جرمانہ شامل ہیں۔ اس قانون کا مقصد بچوں کو تعلیم اور صحت جیسی بنیادی سہولیات سے محروم ہونے سے بچانا ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کا موقف:

اسلامی نظریاتی کونسل نے پاکستان کی پارلیمنٹ سے منظور ہونے والے ۱۸/سال سے کم عمر بچوں کی شادی کے بل کو غیر شرعی قرار دیکر اسے مسترد کر دیا ہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس کے بعد جاری ہونے والے بیان میں کہا گیا کہ اس بل میں عمر کی حد مقرر کرنے اور ۱۸/سال سے کم عمری کی شادی کو 'چائلڈ ابیوز' قرار دینا اسلامی احکام کے مطابق نہیں۔

جمعیت علماء اسلام کا موقف:

جمعیت علماء اسلام کے امیر اور رکن قومی اسمبلی حضرت مولانا فضل الرحمٰن مدظلہم نے پشاور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم چائلڈ میرج ایکٹ کو مسترد کرتے ہیں۔ ملک میں قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی ہو رہی ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن نے کہا کہ پاکستان میں قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بن سکتا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے اس قانون کو مسترد کیا ہے۔ اس کے باوجود اس متنازع قانون پر صدرِ پاکستان نے دستخط کر دیے۔ جو کام شرعی طور پر جائز ہے اس پر قید اور جرمانے کی سزائیں دی جارہی

ہیں۔ زنا کے لیے راستے کھولے جارہے ہیں اور نکاح کو مشکل بنایا جارہا ہے۔ وہ پاکستان جو اسلام کے نام پر بنا تھا اس کی اسلامی شناخت کو ختم کیا رہا ہے۔

اسی طرح سینیٹر مولانا عبدالواسع نے بھی کہا کہ پارلیمنٹ قرآن وسنت کے منافی بل منظور نہیں کرسکتی۔ ’ہم اس بل کی مذمت کریں گے۔‘

کم عمری کی شادی اور اسلامی نکتہ نظر:

کم عمری شادی کے متعلق اسلامی احکام نہایت واضح ہیں۔ جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن سے جاری ہونے والا ایک فتویٰ اس مسئلے کو واضح کرتا ہے:

سوال: کیا ۱۸ سال سے کم عمر کی لڑکیوں کی شادی جائز ہے؟ اور اس کی شرعی دلیل کیا ہے؟

جواب: واضح رہے کہ اسلام میں لڑکے یا لڑکی کے لیے شادی کی کوئی خاص عمر متعین ومقرر نہیں کی گئی ہے، کسی بھی عمر میں شادی کرائی جاسکتی ہے، البتہ بلوغت سے پہلے لڑکے/لڑکی خود سے شادی نہیں کرسکتے، بلکہ ولی کو ان کی شادی کرانے کا حق ہوتا ہے، چناں چہ قرآن پاک میں ہے:

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ

اس آیت میں ان لڑکیوں کی عدت طلاق تین ماہ بیان کی گئی ہے، جن کو ابھی تک حیض نہیں آیا، ظاہر ہے کہ عدت کا سوال طلاق کے بعد ہی ہوسکتا ہے، اور جب تک نکاح صحیح نہ ہو طلاق کا کوئی احتمال ہی نہیں، اس لیے اس آیت نے نابالغ لڑکیوں کے نکاح کو واضح طور پر جائز قرار دیا ہے، اسی طرح حدیث شریف میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شادی (نکاح) چھ سال کی عمر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوئی، ہاں مباشرت کے حوالے سے اسلام میں یہ قید لگائی گئی ہے اگر لڑکی جماع کی متحمل نہ ہو تو شوہر کو اس سے صحبت کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، اور اگر وہ جماع کی متحمل ہو نیز کسی مرض کا اندیشہ بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں شوہر کو اس سے صحبت کرنے کی اجازت ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل کی رو سے صورتِ مسئولہ میں لڑکی کی شادی اٹھارہ سال سے کم عمر میں کرانا جائز ہے، البتہ صحبت کے حوالے سے دیکھا جائے گا کہ اگر وہ جماع کی متحمل ہے تو پھر اس سے جسمانی صحبت بھی جائز ہوگی۔ (دارالافتاء جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن، فتویٰ نمبر: 144307102504)

شادی کی کم سے کم عمر کیا ہے؟

اسی طرح جامعہ بنوری ٹاؤن کے دارالافتاء نے اس سوال کہ شادی کی کم سے کم عمر کیا ہے؟ کے جواب

میں کہا ہے کہ:

’’لڑکے یا لڑکی کے نکاح کے لیے شرعاً کوئی مدت یا عمر متعین نہیں ہے، بلکہ عمر کے کسی بھی حصے میں لڑکے یا لڑکی کا نکاح ہوسکتا ہے، البتہ بلوغت سے پہلے لڑکا یا لڑکی خود نکاح کا عقد نہیں کر سکتے، بلکہ ان کا ولی (والد یا دادا وغیرہ) ان کے مصالح کو مدنظر رکھ کر نکاح کر سکتا ہے، ولی کے علاوہ کسی اور نے بلوغت سے پہلے بچے یا بچی کا نکاح کرادیا تو وہ بلوغت کے بعد لڑکے یا لڑکی کی اجازت پر موقوف ہوگا۔

صحیح احادیث کے مطابق ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح چھ سال کی عمر میں ان کے والد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کر دیا تھا، اور نو سال کی عمر میں آپ رضی اللہ عنہا کی رخصتی عمل میں آئی۔(فتویٰ نمبر:144107200690)

نکاح صغیرہ کے متعلق کتب حدیث وفقہ میں واضح احکام موجود ہیں، صغیر وصغیرہ کا نکاح کروانا جائز ہے۔ اس کے قائل مذاہب اربعہ کے فقہائے کرام ہیں۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر صغیرہ سے نکاح کرنا درست نہیں ہوتا تو اس آیت مبارکہ میں ان کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

صحابہ کا اپنی کم عمر بچیوں کی شادی کرنا:

ایسی بہت سی احادیث ہیں جن میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ذکر کیا گیا ہے کہ انہوں نے صغیرہ سے نکاح فرمایا ہے۔

چناں چہ حضرت ام کلثوم جو کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہونے والی بیٹی ہیں، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نواسی ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت حاصل کرنے کے لیے اپنے زمانہ خلافت میں سن ۱۷ھ میں ان کا رشتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مانگا تو حضرت علی رضی اللہ نے بخوشی ان کو یہ رشتہ دے دیا، یوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چالیس ہزار درھم مہر کی رقم مقرر کر کے ان سے نکاح کیا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے داماد بن گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ان سے ایک بیٹا زید بن عمر اور ایک بیٹی رقیہ بنت عمر پیدا ہوئی۔

خیال رہے کہ حضرت ام کلثوم بنت فاطمۃ الزہراء کی ولادت چھ ہجری میں ہوئی تھی، جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نکاح ۱۷ھ میں ہوا، اس اعتبار سے نکاح کے وقت حضرت ام کلثوم کی عمر ۱۳ برس بنتی ہے۔

اسی طرح حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی ایک بیٹی کا نکاح عروۃ بن الزبیر سے اور عروۃ بن الزبیر نے اپنی بھتیجی کا نکاح اپنے بھتیجے سے اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بیوی نے اپنی لڑکی کا نکاح ابن المسیب بن نخبۃ سے کم سنی

میں کیا۔ (الفقہ الاسلامی وادلتہ جلد ۷، صفحہ ۱۸۰)

اسلام دین فطرت ہے:

اسلام دین فطرت ہے، اس میں انسانی جذبات واحساسات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے، ان خیالات پر عمل درآمد کے لیے جائز ذرائع بھی بتائے گئے ہیں۔ اسلام میں نکاح محض جنسی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے، دو خاندانوں کے باہمی تعلق قائم کرنے؛ اور دونوں طرف کے رشتوں کے محبت واحترام کا باعث ہے، نکاح صرف میاں بیوی کے تعلق کا نام نہیں بلکہ یہ ایک خاندان اور خاندان سے معاشرے کی تشکیل کا نام ہے۔

اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ افراد معاشرہ کو محض قانون کے ڈنڈے سے نہیں چلاتا بلکہ ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت پر توجہ دیتا ہے، وہ فرد میں احساس ذمہ داری پیدا کرتا ہے۔ حدود وقیود میں بند نہیں کرتا، نہ معاشرے پر ایسی قدغنیں نہیں لگاتا جن کے بروئے کار آنے پر بدی کا راستہ کھلے۔ چناں چہ علماء وفقہاء نے اس ضمن میں انسان کی فطری ضرورتوں پر شاندار کلام کیا ہے۔

انسانوں اور مختلف خطوں کے احوال یکساں نہیں ہوتے۔ بعض علاقوں کی آب وہوا ایسی ہوتی ہے کہ جس سے انسانی نشوونما تیز رفتار ہوتی ہے۔ لڑکے لڑکیوں کی جسمانی ساخت مضبوط ہوتی ہے، وہ کم عمری میں ہی نکاح کے بندھن کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ وہاں کے معاشرے اگر لڑکے لڑکیوں کی شادی کے لیے ۱۸ر سال کی عمر تک پہنچنے کا انتظار کریں تو فتنے میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔

بعض صورتوں میں لڑکے یا لڑکی کے والدین کے فوت ہوجانے کی وجہ سے انہیں تحفظ کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی ایک مناسب صورت نکاح ہے۔

جب کبھی ملکوں کے درمیان جنگیں ہوتی ہیں تو معاشرے اخلاقی طور پر تباہی کے دہانے پر پہنچ جاتے ہیں، بچے بچیاں اغوا ہوتے ہیں، ان کا جنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ دورِ جدید کا عام مشاہدہ ہے کہ جنگ زدہ علاقوں سے معصوم بچیوں کو اغوا کرکے یورپ وامریکا کے قحبہ خانوں میں پہنچایا گیا۔ اس قسم کی صورت حال سے بچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کا نکاح کرکے کسی کی ذمہ داری میں دے دیا جائے۔

موجودہ دور میں جبکہ سوشل میڈیا کے ذریعے بدی، فحاشی، عریانی اور شیطنت کا عالم گیر پھیلاؤ ہو چکا ہے، اور موبائل کے ذریعے معصوم اذہان تیزی سے مسموم ہو رہے ہیں، اخلاقی بگاڑ اور جنسی انارکی عام ہو رہی ہے، نابالغ بچے بچیاں بے حیائی پر مبنی ویڈیوز اور ڈرامے دیکھ کر قبل از بلوغت ناجائز جنسی تعلقات قائم کر رہے ہیں، ان حالات میں

تو اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ والدین بچوں کے سن بلوغت کو پہنچتے ہی ان کی شادیاں کر دی جائیں۔

کم عمری کی شادی کی ممانعت کس کا ایجنڈا ہے؟

شادی کے لیے کم از کم عمر کا تعین اور کم عمری کے نکاح کی ممانعت دراصل مغربی ایجنڈے کی تکمیل ہے۔ یہ ممانعت آج کے ان عالمی قوانین کا حصہ ہے جو اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے فلسفہ اور چارٹر کے زیر سایہ دنیا بھر میں نافذ کرنے کی کوشش کی جاری ہے اور مغربی ممالک ہر قسم کا دباؤ ڈال کر مسلم ممالک کو بالخصوص ان عالمی قوانین کی پابندی قبول کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس ایجنڈے کی اصل یہ ہے کہ معاشرے کے افراد کو آزاد کر دیا جائے، وہ کسی مذہب، عقیدے، خاندان، اور ماحول کی جکڑ بندیوں سے آزاد رہ کر کسی سے بھی تعلقات قائم کر سکیں، چناں چہ مغربی معاشروں میں کم عمر لڑکے لڑکیوں کا بوائے فرینڈ اور گرل فرینڈ بننا عام چلن ہے، لیکن نکاح کے بندھن میں بندھنا ان کے لیے گھٹن کا باعث بنتا ہے۔

حقوق انسانیت کے علمبردار ممالک میں دس سے گیارہ سال کی بچیوں کی بڑی عمر کے مردوں سے نہ صرف شادیاں ہوتی ہیں بلکہ ان کا جنسی استحصال بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات انہیں مشرقی ممالک سے خرید کر بغیر شادی کے بھی رکھا جاتا ہے۔ ان سے جسم فروشی بھی کروائی جاتی ہے۔ کئی ممالک میں بارہ سال کے بچے قانونی طور پر شادی کر سکتے ہیں۔ دنیا کے سب سے کم عمر اور غیر شادی شدہ والدین میں لڑکی پندرہ سال کی اور لڑکا گیارہ سال کا ہے۔ (سین سٹیورٹ 11 گرل فرینڈ ایما وبیسٹر 15) دنیا بھر کا میڈیا انہیں ایسے کوریج دے رہا تھا جیسے انہوں نے مریخ فتح کر لیا ہو۔ مغرب یہی کچھ ہمارے معاشروں سے توقع رکھتا ہے۔

خاندانی نظام کو تباہ کرنے والے قوانین:

اسی مغربی ایجنڈے پر چلتے ہوئے ہماری حکومتیں آئے روز ایسے قوانین پاس کر رہی ہیں جو نہ صرف قرآن وسنت کے خلاف ہیں بلکہ خاندانی نظام کو تباہ کرنے والے اور بے حیائی وفحاشی کو پروان چڑھانے والے ہیں۔ مثلاً:

۱۹۶۱ء کا فیملی لاء آرڈیننس۔

دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی سے اجازت لینے کا قانون۔

طلاق کا حق بیوی کو تفویض کیا جانا۔

گھریلو تشدد (روک تھام اور تحفظ) بل (2009)

ایسڈ کنٹرول اور ایسڈ کرائم سے بچاؤ ایکٹ (2010)

ورکپلیس ایکٹ (2010) میں خواتین کو ہراساں کرنے کے خلاف تحفظ۔

فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ (2010)

خواتین سے بچاؤ کے عمل سے روک تھام کا قانون (2011)

پریشانی اور حراستی فنڈ میں خواتین (2011)

فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ (تیزاب سے متعلقہ جرائم کی روک تھام کا نشانہ) (2011)

گھریلو تشدد سے بچاؤ اور تحفظ بل (2012)

قومی کمیشن برائے حیثیت برائے خواتین ایکٹ (2012)

قومی کمیشن برائے انسانی حقوق ایکٹ (2012)

خواجہ سراافراد (تحفظ حقوق) ایکٹ۔ 2018ء

خواتین، تشدد اور جرگہ ایکٹ

مسلم فیملی لاءز آرڈیننس (1961ء)

اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکے لڑکیوں کے قبول اسلام کے خلاف بل۔

ان قوانین کا گہرا مطالعہ وتجزیہ کیا جائے تو آپ کو صاف محسوس ہوگا کہ ان کی اکثر شقیں قرآن وسنت سے متصادم، اور ہماری اخلاقی اور مقامی ثقافتی اقدار کے خلاف ہیں۔ ان تمام کی روح عورت کو شرعی حدود وقیود سے آزادی دلانا ہے۔ آپ عدالتوں کا رخ کر کے معلوم کر لیجیے کہ جب کوئی عورت خلع کے لیے کیس دائر کرتی ہے تو نہایت سبک روی کے ساتھ خلع کی ڈگری جاری کر دی جاتی ہے۔ یہاں عورت کو ایک ''ظالم خاوند'' سے تو نجات مل جاتی ہے لیکن ایک گھر ٹوٹنے کے بعد بچوں پر کیا گزرتی ہے؟ دو خاندانوں کے درمیان چپقلش اور دشمنی کا جو نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس پر عدالت کچھ سروکار نہیں رکھتی۔

پھر یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ ان قوانین کی تان صرف ہمارے خاندانی نظام پر آ کر ہی کیوں ٹوٹتی ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ ہر اس قاعدے اور ضابطے کو روندا جا رہا ہے جو ہمارے خاندانی نظام کو جوڑتے ہیں اور مضبوط بناتے ہیں۔ عورت کو بااختیار بنانے کا نعرہ بظاہر نہایت خوش کن ہے، مگر کیا اس کے نتائج وعواقب پر بھی غور کیا گیا؟۔

آپ نے بے حیائی اور فحاشی کو کھلی چھوٹ دے رکھی ہے۔ ٹی وی چینلوں کے پروگراموں اور سوشل میڈیا کی ویڈیوز میں چھوٹی چھوٹی بچیاں نہ صرف دھڑلے سے اپنے ناجائز تعلقات کا اعتراف کرتی نظر آتی ہیں بلکہ اپنے اسقاط حمل کے لیے رجوع کیے جانے والے ڈاکٹرز اور کلینکس کا پتہ بھی بتاتی ہیں۔

گیارہ بارہ سال کے بچے بچیاں جنہیں والدین اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے بھیجتے ہیں وہ ایک دوسرے کو رجھانے میں مصروف ہیں۔ والدین کے لیےتو وہ ابھی بچے اورمعصوم ہیں لیکن فطری تقاضوں اور انٹرنیٹ نے انہیں قبل از وقت بالغ بنادیا ہے۔ ہمارے کالجز یونیورسٹیز تعلیمی ادارے کم اور ڈیٹنگ پوائنٹ زیادہ لگتے ہیں۔کون سی یونیورسٹی ہےجس کےمتعلق غیراخلاقی حرکات اوراسکینڈلز کے بارے میں رپورٹس نہ آئی ہوں؟۔

ان سب غیراخلاقی اورغیرشرعی حرکات پرتوکسی این جی او،حکومت اور نام نہاد روشن خیالوں کوکوئی اعتراض نہیں لیکن اگرقرآن وسنت کےمطابق بارہ تیرہ سالہ بچے اور بچی کی شادی کردی جائےتو ہنگامہ بپا کردیا جاتا ہے۔وجہ صرف یہ ہے کہ نکاح کوقرآن پاک سورۃ النساء میں ’حصن‘ یعنی قلعے کانام دیتا ہے،یعنی گناہ سےمحفوظ رہنے والا قلعہ۔ اگرنکاح کوعام کردیا گیاتو یہود ونصاریٰ کا ہم پہ غلبہ ناممکنات میں سے ہوگا۔ان کا پورا زور ہمیں دین اسلام پرعمل کرنے سے روکنے پر ہے۔اس سلسلے کی سب سے پہلی کڑی خاندانی نظام کوتباہ کرنااور زنا کوعام کرنا ہے۔ابھی چند دن قبل اسلام آباد میں ایک ٹک ٹاکرلڑکی کواس کےآشنا نےقتل کردیا،اس قتل کے بعد دو باتیں ہوئیں،لبرلز نے فوراً اپنا محاذ سنبھال لیااوراسلام کے نظام عفت وعصمت،خاندانی عصبیت،اوراخلاقی حدود وقیود کوآڑے ہاتھوں لینا شروع کردیا۔جب تلک قاتل کی شناخت اوروجہ قتل معلوم ہوئی لبرلز سوشل میڈیا کےذریعے اپنا زہر پھیلا چکے تھے۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ ایک ٹک ٹاکر کےقاتل کومحض بیس گھنٹوں میں گرفتار کرلیا گیا۔اس ملک میں ایک غیرمعروف ٹک ٹاکر کی بنسبت کئی محترم شخصیات؛جن میں جیدعلماء کرام بھی شامل ہیں؛ کو بیدردی سےشہید کیا گیا۔اس سے آپ ریاست کی ترجیحات کااندازہ کرسکتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہماری دینی جماعتیں اورسرکردہ علمی شخصیات اسمبلیوں سے پاس ہونے والے عائلی قوانین کا جائزہ لیں،اس سلسلے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات کوبھی عوامی آگاہی کے لیےمنظرعام پرلانے کی سعی کی جائے،تاکہ معلوم ہوسکے کہ اسلامی قوانین کے حوالے سے اسلامی نظریاتی کونسل اب تک کیا کام کرچکی ہے،اورکون کون سےقوانین اسلام اورآئین سے متصادم ہیں؟!۔اس سلسلے میں بھرپورعوامی جدوجہد مرتب کی جائے،اورایسے تمام کالےقوانین کوختم کرانے کی سعی کی جائے جواسلام اورآئین سےمتصادم ہیں۔

ہماری دانست میں یہ بہت ضروری کام ہے،بےحیائی کا سیلاب بلا ہماری دینی،اخلاقی اورمعاشرتی اقدار کو بہت تیزی سے بہائے لے جارہا ہے۔دوسری طرف مخصوص لبرل اورسیکولر لابیاں جو ہمیشہ سرگرم رہتی ہیں ان کا سدباب کرنے کی کوشش کی جائے۔اللہ تعالیٰ ہمارا ہرقدم پرحامی وناصر ہو۔آمین!۔

مدرسین حضرات کیلئے دس نصیحتیں

مولانا قاری امیر حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ

(۱) استحضارِ نعمت: میرے محترم دوستو اور بزرگو! اللہ پاک نے ہمیں یہ خدمتِ دین کی دولت عطا فرمائی ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ جن لوگوں کو مدارس و مکاتب میں معصوم بچوں کی خدمت اور قرآن مجید کی تعلیم و تعلّم یا فقہ و حدیث کا درس دینے کی توفیق مل گئی ہے گویا کہ انہیں حق تعالیٰ نے قبول فرمالیا ہے۔ اس لئے دین کی خدمت لے رہے ہیں۔ آپ حضرات اس توفیق کی قدر کیجئے اور یکسوئی کے ساتھ لگے رہیے۔ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں فرماتا۔ روزی ہر شخص کی مقرر ہے، ان شاء اللہ مقدر مل کر رہے گا۔ آدمی چاہے کتنا ہاتھ پیر مار لے، تقدیر سے بڑھ کر نہیں پاسکتا۔

دوستو! اصل میں دین کی حفاظت اور دین کا کام مل جانا، بہت بڑی نعمت ہے، اس سے ہم لوگ بہت غافل ہیں اور اسی غفلت کی وجہ سے بہت کم شکر کی توفیق ملتی ہے۔ آج ہم کھانے پینے کی چیزوں کو نعمت سمجھتے ہیں، لیکن دین و ایمان کا نعمت ہونا بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ پہلے زمانہ میں لوگ ایک مرتبہ اللہ کا نام لینے کی توفیق کو دنیا و مافیہا سے بہتر سمجھتے تھے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ **خیر کم من تعلم القران و علمه** "تم سب میں بہترین وہ ہے جو قرآن پاک سیکھے اور سکھائے" (ہاں حسن نیت شرط ہے)۔

(۲) اخلاص: امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ لاکھ احادیث میں سے پانچ حدیثیں منتخب کی ہیں، ان میں ایک **انما الأعمال بالنيات** ہے یعنی سارے اعمال کا دارومدار نیت پر ہے، اس لئے اپنی نیت درست کر لینی چاہئے، اس کام سے صرف اللہ کی رضا جوئی مقصود ہو کسی اور غرض سے دین کا کام نہ کریں، اس کو دنیا کمانے اور پیٹ پالنے کا ذریعہ نہ بنائیں، اخلاص بہت بڑی دولت ہے۔ اس کی برکت سے اعمال قبول ہوتے ہیں، ان میں جان آتی ہے، ان میں زبان آجاتی ہے، یہاں تک کہ میں نے آپ حضرات کو اس کام کی عظمت و اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے اب چند تجربہ اور اصول کی باتیں بتلاتا ہوں، جن سے کام میں رہبری ملے گی۔

(۳) استغناء و یکسوئی: حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو حیدرآباد بلایا گیا تھا۔ حضرت اس وقت سہارنپور میں تھے۔ اس وقت سہارنپور میں حضرت کی تنخواہ ۲۰/۲۵ روپے ہوگی،

حیدرآباد میں رہنے کے لیے بارہ سو روپیہ ماہانہ، گاڑی اور بنگلہ پیش کیا گیا، حضرت نے اس وقیع پیش کش کو (جو اس زمانے میں کسی کسی کو مقدر سے ہاتھ آتی تھی) مسترد فرما دیا اور فرمایا: میں اپنے حضرت (یعنی حضرت خلیل احمد سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ) کو اور اپنے مدرسہ (یعنی مظاہر علوم) کو نہیں چھوڑ سکتا۔

میں ابھی مدینہ منورہ میں تھا۔ وہاں کے لوگوں نے کہا کہ ہم اقامہ دلا دیں گے اور فلاں فلاں سہولت بھی دے دیں گے، مگر میں نے یہی سوچ کر انکار کر دیا کہ حضرت کے ہاں (اشرف المدارس ہردوئی) برسوں سے پڑھاتا ہوں، چھٹی لے کر گیا تھا، اگر وہیں رہ جاؤں تو حضرت (مولانا ابرار الحق صاحب نور اللہ مرقدہ) کیا سمجھیں گے؟ مدرسہ سے کس قدر بے وفائی ہوگی، یعنی کتنی انتظامی دشواری پیش آئے گی؟، یہی سوچ کر میں نے ان حضرات سے معذرت کر دی، ورنہ بتائیے مدینہ منورہ میں رہنے کا موقع مل جائے تو کون نہیں رہنا چاہتا؟ لوگ ہزاروں ریال خرچ کر رہے ہیں، برسوں سے تمنائیں کر رہے ہیں مگر موقع نہیں ملتا۔

(۴) تادیب میں احتیاط: بچوں کو جس طرح چاہے پٹائی نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ ایک تو اب قویٰ کمزور ہوں گئے ہیں، بچوں میں تحمّل نہیں رہا۔ ایک آدھ چھڑی لگا دی تو الگ بات ہے، مگر ان پر غصہ نہیں نکالنا چاہیے۔ آج کل یہ مرض عام ہو گیا ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا حساب ہوگا۔

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک صاحب نے لکھا کہ میں بچوں کو بہت مارتا ہوں، حضرت نے جواب لکھ دیا: ''قیامت کا انتظار کرو'' کیا مطلب؟ قیامت کے دن تو حساب دینا پڑے گا، اس کی نافرمانی اور تمہاری سزا دونوں تولے جائیں گے اور انصاف کیا جائے گا۔ اس لئے بہت ڈرنے کا مقام ہے۔

(۵) دعا کا اہتمام: اسی طرح طلبہ کے لئے اور اپنے لئے گڑگڑا کر دعا مانگنے کا اہتمام کرنا چاہئے، یہ بھی سنت ہے، لوگ اس سنت سے غافل ہیں، علماء نے لکھا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت ''ابتہال'' بھی ہے، یعنی گڑگڑانا، اس سے بہت کام نکلتے ہیں اور کچھ نہیں تو دل کو سکون ہی مل جاتا ہے، یہ کتنی بڑی نعمت ہے؟۔

(۶) توکل اور اعتماد: اسی طرح بھائیو! مقصد بس دین کو بناؤ، دنیا کو مقصود نہ بناؤ، جو مقدر کا ہے مل کر رہے گا اور جو مقدر نہیں ہے وہ تم چاہے کچھ کر لو ملنے والا نہیں۔ شیخ العرب والعجم حاجی امداد اللہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ دین کی مثال پرندہ کی سی ہے اور دنیا کی مثال جیسے سایہ، پرندہ کو پکڑو گے تو سایہ خود بخود آ جائے گا اور سایہ کے پیچھے پڑو گے تو نہ وہ ملے گا نہ یہ۔

(۷) معاملات کی صفائی: ایک بات آپ حضرات سے یہ عرض کرنی ہے کہ اپنے معاملات درست رکھیں۔ آپ کے معاملات درست نہ ہوں گے تو آپ دوسروں کو کیا دین سکھائیں گے؟ مگر آج لوگ دین بھی نہیں سمجھتے۔ نماز

روزہ ادا کررہے ہیں، مگر معاملات غیر شرعی ہیں، معاملات خلاف سنت ہیں۔

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اتنی ساری کتابیں لکھیں، مگر تصوف پر کوئی کتاب نہیں لکھی؟ فرمایا: ''میں نے کتاب البیوع لکھ دی ہے، جس کے معاملات درست ہوں وہ سب سے بڑا صوفی ہے۔''

معاملات کی درستگی سے بڑی برکت ہوتی ہے۔ آمدنی اگر صحیح ہوتو تھوڑے میں بھی کام نکل جاتا ہے۔ برکت کے معنی یہ نہیں کہ ایک ہزار کے دو ہزار ہوجائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تھوڑے میں بھی کام نکل جائے۔

(۸) حکمت عملی کا لحاظ: اسی طرح ایک بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ طلبہ کو افہام وتفہیم اور نصیحت موقع محل دیکھ کریں، بعض مرتبہ بے سلیقہ نہ ہونے کی وجہ سے اچھی بات بھی ضائع ہوجاتی ہے اور نفع کے بجائے نقصان ہوجاتا ہے، نصیحت کو یوں سمجھئے جیسے انجکشن دینا، بغیر سیکھے انجکشن نہیں دے سکتے اور ہر جگہ نہیں دے سکتے، بس یہی حال نصیحت کا ہے کہاں کی جائے اور کہاں نہیں؟ کیا کیا جائے اور کیا نہیں؟ اور کس طرح کی جائے کس طرح نہیں؟ سب سیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

(۹) خدمت خلق: ایک بات یہ ہے کہ ہمیں کبھی کبھی اپنے چھوٹوں اور عوام الناس کی خدمت بھی کردینی چاہئے۔ اس سے ایک طرف سارے نفس کا علاج ہوتا ہے، دوسری طرف سامنے والا متاثر و مانوس ہوتا ہے۔ جب ہماری ذات سے متاثر ہوگا تو ہماری بات کا بھی اثر لے گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک یہودی بچہ ہے اس کے پاس برتن میں پانی بھرا ہوا ہے مگر وزن اس قدر ہے کہ لے کر جانہیں سکتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی سے بھرا ہوا برتن اٹھا کر اس کے گھر پہنچادیا اور چلے گئے، جب اس کے باپ نے دیکھا کہ بچہ اتنا بڑا برتن لے آیا تو حیرت سے پوچھا کہ کیسے لے آیا؟ اس نے بتلایا کہ کوئی صاحب پہنچا گئے، اس کو بڑا اثر ہوا اور سوچا کہ کون آدمی ہے جو اس قدر مخلص اور اخلاق مند ہے؟ باہر آکر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں بس فوراً پکار اٹھا: **ماھذا الاشفقۃ الانبیاء والمرسلین۔** یہ تو بس انبیاء اور مرسلین ہی کی شفقت ہوسکتی ہے

(۱۰) اپنی اصلاح کی فکر: اسی طرح ہم لوگوں میں اب ایک غفلت عام ہوگئی ہے کہ ذرا پڑھنا لکھنا شروع کیا امام بن گئے اور کچھ کام شروع کیا، تو بس اپنے آپ کو کامل سمجھ بیٹھے ایسا نہ ہونا چاہئے، بلکہ ہر وقت اپنی اصلاح و تربیت کی فکر میں بھی لگے رہیں۔

پہلے زمانہ میں لوگ جب تک کامل نہ ہوجاتے دین کی خدمت میں نہ لگتے تھے، لیکن آج کل کے حالات ایسے نہیں ہیں، اس لئے کام کے ساتھ ساتھ اصلاح کی بھی فکر کرتا رہے، مایوس نہ ہو، ایک دن کامیاب ہوجائے گا۔ خواجہ

صاحب فرماتے ہیں:

نہ چت کر سکے نفس کے پہلوان کو تو یوں ہاتھ پیر بھی ڈھیلے نہ ڈالے

ارے اس سے تو ہے کشتی عمر بھر کی کبھی وہ دبالے کبھی تو دبالے

اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ فرصتِ عمر کو غنیمت سمجھ لے اور زندگی پر اعتبار اور بھروسہ نہ کرے، نہ معلوم کب یہ نعمت ختم ہو جائے اور کب آدمی عمل سے روک دیا جائے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ کوئی خاص نصیحت جو نافعِ سلوک ہو تحریر فرما دیجئے۔ اس کے جواب میں حضرت نے لکھا کہ: ''اس کا استحضار ہو کہ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔''

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب کسی کام سے فارغ ہوتے تو فرماتے: ''اے اللہ تیرا شکر ہے کہ اسباب ہلاکت سے ہم بچ گئے۔''

بس ان چند باتوں کو یاد رکھ لیجئے اور عمل کرتے رہئے۔ ان شاء اللہ دنیا و آخرت کا بھلا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو حُسنِ نیت، حسنِ عمل اور حسنِ خاتمہ کی دولت سے سرفراز فرما دیں۔ آمین۔

بقیہ: اہلِ بیتِ اطہار رضی اللہ عنہم، تذکرہ و مختصر تعارف

یہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت ہیں، اہلِ ایمان کی آنکھوں کے تارے، دل کا سرور، ایمان کا مرکز و محوَر، سفینۂ نجات، محبت کا مرجع ہیں، مودت و عقیدت ان سے واجب اور اتباع ان کی ضروری ہے، تعظیم و توقیر ناگزیر اور اکرام و احترام لازم ہے، یہ سب تسلیم و رضا اور صبر و استقلال کے کوہِ گراں تھے، ان کی زندگی کا مقصدِ وحید رضائے الٰہی کا حصول تھا۔ جینا اور مرنا فقط منشائے الٰہی کے مطابق و موافق تھا، حق کے لیے ڈٹ جانا اور باطل سے لڑ جانا ان کا وصفِ ممتاز تھا، وہ دنیا و آخرت میں سرخرو ٹھہرے، نجات و ہدایت کی تمام راہیں انہی سے کھلتی ہیں اور انہی پر بند ہو جاتی ہیں۔

اسلامِ ما اطاعتِ خلفائے راشدینؓ

ایمانِ ما حُبِ آلِ محمدؐ است

مطالعے کی میز پر

مرتب: محمد احمد حافظ

علم کب معتبر ہے:

طلب علم اسی وقت معتبر ہے جبکہ اس طلب کا مقصود اللہ جل جلالہ کی رضا ہو۔ آدمی علم طلب کر رہا ہے لیکن اس لیے کر رہا ہے کہ دنیا کماؤں گا، اس لیے کر رہا ہے کہ وہ دنیا میں اپنا نام پیدا کرے گا، دنیا اس کو بڑے بڑے القاب سے یاد کرے گی اور اس کی دنیا جہان میں شہرت ہوگی، اگر اس نیت سے کر رہا ہے تو اس علم کی ایک دمڑی قیمت نہیں۔ یہ طلب علم اسی وقت معتبر ہے جبکہ اس کا مقصود اللہ تعالیٰ کی رضائے کامل ہو۔ (شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم ۔خطاب بموقع جلسہ دستار بندی جامعہ فاروقیہ کراچی)

بہترین دعا:

مسلمان کی بہترین تلوار دُعا ہے، سو اسی سے کام لینا چاہیے، ہر وقت دعا کرنا چاہیے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا چاہیے، کیا عجب کہ اللہ تعالی اس امت کی دعا سن لے اور اس کی غریبی پر رحم فرمائے، میں اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں، تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر یورپ کا فلسفہ وغیرہ پڑھنے میں گنوائی، خدا تعالی نے مجھے قوائے دماغی بہت اچھے عطا فرمائے تھے، اگر یہ قویٰ دینی علوم کے پڑھنے میں صرف ہوتے، تو آج خدا کے رسول کی میں کوئی خدمت کر سکتا، اور جب مجھے خیال آتا ہے کہ والد مکرم نے مجھے دینی علوم پڑھانا چاہتے تھے، تو مجھے اور بھی قلق ہوتا ہے کہ باوجود اس کے کہ صحیح راہ معلوم بھی تھی، تو بھی قوت کے حالات نے اس راہ پر چلنے نہ دیا، بہر حال! جو کچھ خدا کے علم میں تھا ہوا، اور مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکا میں نے کیا، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا، اور زندگی تمام وکمال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی''۔ (کلیات مکاتیب علامہ اقبال مرحوم، جنوری 1919ء تا دسمبر 1928ء)

امام کے دائیں طرف نماز پڑھنے کا فائدہ:

مکہ مکرمہ میں ایک بزرگ تھے، انہوں نے امام کے دائیں طرف نماز پڑھی، اسی دوران انہیں ان کے ایک

عزیز دوست مل گئے تو وہ بزرگ کہنے لگے: سنا تھا کہ امام کے دائیں طرف اجر زیادہ ملتا ہے، آج علم ہوا کہ امام کے دائیں طرف دوست بھی ملتے ہیں۔ (روایت: حضرت مولانا ڈاکٹر مولانا عبدالرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ)

درسی کتب کا حق:

درسی کتب کا حق اس وقت ادا ہوتا ہے جب طالب علم: درس سے پہلے اگلے دن کے سبق کی مکمل تیاری کرے، پھر دورانِ درس استاد کے مکمل درس کو غور سے سنے، اور درس کے بعد پھر اس سبق کی دہرائی اور تکرار کرے، اور اگر اس حوالے سے مزید کچھ تفصیلات ہوں تو ان کا بھی مطالعہ کرے۔ الحمدللہ! درسِ نظامی کے دوران عموماً یہی کوشش ہوتی تھی کہ اگلے دن کا درس پہلے سے تیار کرلوں، اگرچہ یہ تسلسل تمام کتابوں میں برقرار نہ رہ سکا، کبھی سستی آ گئی، کبھی کرلیا، کبھی نہیں، لیکن فقہ اور اصولِ فقہ کی تقریباً تمام کتابوں میں الحمدللہ یہ تسلسل برقرار رکھا، اور اس کا فائدہ بھی خوب محسوس ہوا۔ ہدایہ کے متعلق میرا یہ معمول تھا کہ اگلے دن کا درس پہلے سے تیار کرلیتا تھا، کم از کم اتنا ضرور کرلیتا کہ پوری عبارت حل کرلیتا، خاص طور پر اعراب اور ترجمہ سمجھنا، کتاب میں جو حواشی موجود ہوتے، ان کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتا۔ اس کا یہ فائدہ ہوتا کہ اگلے دن استاد کا درس (نفس کتاب کی حد تک) پہلے سے پوری طرح سمجھ آ جاتا پھر دورانِ درس استاد کی اضافی باتوں کو یا میری سمجھ میں کوئی غلطی ہوتی تو اس کی تصحیح کو نوٹ کرلیتا تھا۔ درس کے بعد عموماً یہی معمول ہوتا کہ ساتھیوں کے ساتھ سبق کا تکرار کرتا، خاص طور پر فتح القدیر اور عنایہ جیسی عربی شروح کو بھی ضرور دیکھتا۔ ان میں اگر کوئی نئی بات، قاعدہ یا ضابطہ ہاتھ آتا تو اسے نوٹ کرلیتا، یا کوئی بھی نئی بات میرے ذہن میں آتی تو وہ بھی وہیں کتاب میں درج کرلیتا۔ حواشی وتعلیقات اور اہم باتوں کو نشاندزد کرنے کے لیے میں عموما اپنے پاس پینسل اور ہائی لائٹر رکھتا تھا۔ اس محنت کا فائدہ اسی وقت محسوس ہو گیا تھا، کیونکہ الحمدللہ ہدایہ کے وفاق المدارس کے چاروں پرچوں میں 100 میں سے سو نمبر حاصل کیے۔ آج تک اس محنت کا فائدہ محسوس ہوتا ہے۔ اسی لیے میں طلبہ دوستوں کو یہی مشورہ دیتا ہوں کہ اگر باقی کتابوں میں یہ اہتمام ممکن نہ ہو، تو کم از کم جس فن یا موضوع سے آپ کو زیادہ دلچسپی ہو، اس فن کی تمام کتابیں اسی محنت اور ترتیب سے پڑھیں۔ ان شاء اللہ عمر بھر فائدہ محسوس ہوگا۔ (مفتی شاد محمد شاد)

بچوں کی تعلیم وتربیت کا انداز کیا ہو؟

حضرت مفتی نظام الدین شامزئی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بچوں کی ایسی تعلیم وتربیت جس سے وہ باعمل مسلمان بن جائیں، والدین کے فرائض میں شامل ہے، قرآن کریم میں سورہ لقمان میں بیان کردہ ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا منہج اس طور پر ہونا چاہیے:

1-عقیدہ کی تربیت 2-اعمال کی تربیت 3-ادائیگی حقوق کی تربیت 4-عام معاشرتی اور انسانی آداب کی تربیت۔ان مراحلِ تربیت سے گزرنے کے بعد ایک مسلمان بچہ ان شاء اللہ ایک باعمل مسلمان ثابت ہوگا۔

علامۃ الناس کے معاش کی فکر:

سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ جب مکّہ مکرّمہ پہنچے تو تحریک آزادی کے فکری ونگ کے سربراہ امام شاہ محمد اسحاق دہلوی رحمہ اللہ نے اُن سے عام آدمی کی معاشی حالت اور روزمرّہ کی اشیائے ضروریہ کی قیمتوں اور مہنگائی وغیرہ کے متعلق دریافت فرمایا۔حاجی صاحب حیران ہوئے لیکن پیغام بڑا واضح تھا کہ مولوی، پیر اور لیڈر کو عوام الناس کے معاشی مسائل اور ان کے حل کا شعور ہونا لازم ہے وگرنہ بنیادی معیشت کی آسودگی کے بغیر اخلاقی و روحانی ترقی ناممکن اور فریبِ نظر ہے۔آج ہے کوئی لیڈر، مولوی اور پیر جس کو عوام الناس کے معاشی مسائل کے حل کا فکر ہو؟

واعظین ومقررین خیال رکھیں:

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض واعظین ومقررین خواتین کو اپنی جانب مائل کرنے ک لیے خوبصورت کپڑے زیب تن کرتے ہیں اور خوب بن ٹھن کر رہتے ہیں، بعض اہل علم فرماتے ہیں کہ: نوجوان مقرر جب اپنی ظاہری وضع قطع اور خوب صورتی و جمال کا زیادہ خیال رکھے، اپنی تقریر و وعظ میں کثرت سے اشعار کہے، منفرد حرکتیں اور مختلف قسم کے ذومعنی اشارے کرے، اور مجلس میں عورتیں بھی شریک ہوتی ہوں تو ایسے مقرر سے تحذیر کرنی چاہیے اور لوگوں کو اس سے دور رہنے کی تلقین کرنی چاہیے، کیونکہ اس قسم کے امور منکرات میں داخل ہیں، اور ایسے مقررین سے اصلاح کی بجائے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔جو مقررین زہد و ورع اور تقویٰ وخشیت الٰہی جیسی صفات سے متصف ہوں، باوقار ہوں، علما و صلحا کا لباس زیب تن کرتے ہوں ایسے مقررین کو سنا جائے، ورنہ لوگوں کے اندر صلاح وتقوی کی بجائے ضلالت وگمراہی پیدا ہوگی۔[القصاص والمذکرین (1/298)، معالم القربۃ فی طلب الحسبۃ (ص:181)]

دینی مدارس کے اسٹیج ومنبر کی حرمت:

دینی مدارس محض تعلیمی ادارے نہیں، بلکہ یہ ہمارے اسلاف کی علمی وراثت کے امین اور ان کے فکری تسلسل اور دینی اقدار کے محافظ ہیں۔ان کے پس منظر میں ایک صدی یا دو صدیوں کی نہیں، بلکہ ہزار سالہ تابندہ تاریخ موجود ہے۔

دارالعلوم دیوبند اور اس کے بعد برصغیر میں وجود میں آنے والے مدارس کا قیام محض تعلیمی ضرورت کے تحت نہیں تھا، بلکہ یہ لارڈ میکالے کی مغربی فکر وتہذیب کے خلاف ایک شعوری اور منظم ردعمل تھا۔اسی لیے دینی مدارس کو صرف تعلیمی زاویے سے دیکھنا اور انہیں دنیاوی معیاروں پر پرکھنا نہایت سطحی اور خطرناک طرزِ فکر ہے۔اسی تناظر میں یہ بات نہایت

قابل توجہ ہے کہ دینی مدارس کا منبر ومحراب، ان کے اسٹیج اور مجلسِ خطاب کو ہمیشہ سنجیدگی اور حکمت کے ساتھ استعمال کیا جانا چاہیے۔ یہ مقامات محض اظہارِ رائے کی آزادی کے پلیٹ فارم نہیں، بلکہ دینی تربیت کے سب سے مؤثر ذرائع ہیں۔ مدارس کے طلبہ چونکہ زیر تربیت ہوتے ہیں، ان میں سے بعض کا علمی وعقلی مستوی کبھی وہ نہیں ہوتا، جس کو معیار بنا کر متکلم کی بات کو "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے پیمانے پر تول سکے، وہ اسٹیج پر آنے والے ہر مہمان کو کبھی اپنا استاد بلکہ اگلے دنوں فکری آئیڈیل سمجھنے لگتا ہے۔

ایسے میں اگر ایسی شخصیت جو عصری اداروں سے وابستہ ہو، یا اس فکر کا نمائندہ ہو، خصوصاً جبکہ وہ سوشل میڈیا پر دینی مدارس پر تنقید کے حوالے سے پہچانا جاتا ہو، اسٹیج پر آتا ہے تو اس کی فکر غیر شعوری انداز میں طلبہ کے ذہنوں میں سرایت کر جاتی ہے۔ یہ اثر اگرچہ فوری تو نظر نہیں آتا، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ سوچ، یہ زاویۂ نظر، دینی مزاج اور دینی روایت پر ایک خاموش حملے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور ایسا حملہ جو بظاہر تو زُود اثر نہیں آتا، مگر اندر ہی اندر دینی مزاج کی کمزوری میں (Slow Poison) کا کردار ادا کرتا ہے، دینی علوم کے جدید مناہج، تحقیق کے معاصر اسالیب سبھی قالب ہیں، علوم کی روح اور ہیولی وہی ہیں جو ہمارے ہاں ہیں، یہ جدت اور عصریت زیادہ سے زیادہ تسہیل ہو سکتی ہے، ان کو حاصل کرنا ضروری بھی ہو، تو آپ کے بڑے دینی ادارے اس حوالے سے بھی خود کفیل ہیں، صرف اس پر کام کرنے ضرورت ہے، ویسے بھی مشاہد ہے کہ جو ادارے اس چیز کو ہلکا لیتے ہیں، ان کے ہاں فکری روایت ڈھلان کی طرف ہے۔ ایسے مدارس کے فضلاء کی فکر ونظر روایت سے زیادہ جدت کو تائید کر رہی ہوتی ہے، اس لیے ایک رائے ہے کہ دینی مدارس کی فکری، نظریاتی اور تربیتی فضا کو محفوظ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اسٹیج اور مجلسِ خطاب کو صرف انہی افراد کے لیے مخصوص رکھا جائے جو نہ صرف دینی روایت سے واقف ہوں، بلکہ اس کے علمبردار اور محافظ بھی ہوں۔ (مولانا اکمل جمال)

قمری تقویم:

قمری تقویم کو ہجری تقویم بھی کہتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک میں آپ کے سامنے ایک تحریر پیش ہوئی، جس پر صرف شعبان المعظم لکھا ہوا تھا، سن وغیرہ مرقوم نہ تھا اور اس وقت تک یہی مروج تھا کہ بغیر سن کے قمری تاریخ لکھی جاتی تھی، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ یہ کون سا شعبان ہے؟ امسال کا یا گزشتہ سال کا؟ نیز آپ کو حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے سن کی تدوین کی جانب متوجہ فرمایا تو آپ نے اکابر صحابہ کی میٹنگ بلائی اور مشورہ طلب فرمایا کہ ہمیں سن کس اہم واقعہ سے شروع کرنا چاہیے؟ مختلف

آرا سامنے آئیں، لیکن آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کو قبول فرماتے ہوئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے قمری تقویم کے آغاز کا اعلان فرمایا۔ ہجرت کا آغاز صفر اور تکمیل ربیع الاول میں ہوئی تھی، لیکن محرم الحرام پہلا مہینہ جانا جاتا تھا، اس لیے محرم الحرام کو پہلا مہینہ قرار دے کر ہجرت نبوی کے سال کو پہلا سال قرار دیا گیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت و وفات پر ہجرت کو ترجیح دے کر یہ پیغام دیا گیا کہ مسلمان نظریاتی قوم ہیں، وہ اپنے نظریہ کو مقدم رکھتے ہیں، ہجرت اگر چہ کسمپرسی، مظلومیت و مقہوریت کی داستان ہے، تاہم ہجرت اشاعت اسلام اور غلبہ دین کا ذریعہ بھی بنی۔ ہجرت سے ہی اسلام آفاقی دین بنا، اسی وجہ سے ہجرت کو بنیاد بنایا گیا، تاکہ ہر سال محرم الحرام سے مسلمانوں کو جہد مسلسل، صبر و تحمل، دین کے لیے مشقت و محنت کرنے کا پیغام و درس ملے۔

(مولانا زبیر احمد صدیقی مدظلہم)

دورِ حاضر کا طالب علم:

☆...... جو قرآن مجید کی تلاوت نہیں کرتا۔ ☆...... سنتیں ادا نہیں کرتا۔ ☆...... اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی و انکساری اور خوف و طمع کا اظہار نہیں کرتا۔ ☆...... اس کے اوقات میں ذکر و اذکار کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ ☆...... امام کے سلام پھیرنے کے بعد سب سے پہلے مسجد سے نکلنے والا۔ ☆...... وتروں کا تارک ☆...... نوافل کی ادائیگی سے محروم ☆...... قیام اللیل کی لذت سے نا آشنا ☆...... ''رد'' میں ہوشیار، اپنی زندگی میں سنت کی حفاظت سے غافل۔ ☆...... نفرت دلاتا ہے، خوش خبری نہیں سناتا، فقہ الدعوت سے غافل۔

کیا آپ اسے طالب علم کہہ سکتے ہیں؟...... یہ جہالت کا تاریک کنواں ہے نہ کہ سرچشمۂ علم!

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ (ابو عبدالبر السنی)

محقق ہونے کی علامت:

محقق ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کی بات سے اطمینان اور قلب کو قرار ہو جائے، اور جو شخص غیر محقق اور غیر مبصر ہوتا ہے اس کی بات سے اطمینان نہیں ہوتا، اگر چہ بڑی بڑی باتیں ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ (حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ۔ (ملفوظات ص ۳۹/ج ۱)

☆☆☆